رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۶ عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

اسلام کے خاندانی نظام پر مستند کتابیں

اجتماعی زندگی میں عورت کا مقام کیا ہے اور عورت و مرد کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟

عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کا سنگِ بنیاد ہے اور کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد اس قانون کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا جو اس تعلق کو منضبط کرنے کیلیے بنایا گیا ہو کیونکہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک عمر کے ہر حصہ میں یہ قانون کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر وہ بچہ ہے تو ماں اور باپ کے تعلقات اس کی تربیت میں مؤثر ہونگے۔ اگر جوان ہے تو خود اس کو ایک شریکِ زندگی سے واسطہ پڑے گا۔ اگر سن رسیدہ ہے تو اس کی اولاد ازدواجی تعلقات میں بندھ جائیگی اور اس کے قلب و روح کا سکون اور اس کی زندگی کا چین بڑی حد تک بہو بیٹے اور بیٹی داماد کے تعلقات کی بہتری پر منحصر ہوگا۔ غرض قانونِ ازدواج ایسا قانون ہے جو قوانینِ تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے۔ اسلام کے قانونِ ازدواج کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ فرمائیے۔

پردہ
نواں ایڈیشن
قیمت ۴/-
از سید ابوالاعلیٰ مودودی

حقوق الزوجین
چھٹا ایڈیشن
قیمت ۲/-
از سید ابوالاعلیٰ مودودی

میرج کمیشن رپورٹ ایکسرے
قرآن و سنت کی روشنی میں
انگریزی ایڈیشن ۱۰ روپے
اردو ۲/۱۲

اسلام اور ضبط ولادت
چھٹا ایڈیشن
قیمت ۱/-
از سید ابوالاعلیٰ مودودی

کیا پردہ ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے — ؟
از: پروین رضوی — قیمت ۲/

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۱-سی-شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۶	بابت اپریل سنہ ۱۹۶۱ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان میں عیسائیت کا سیلاب جس تشویشناک سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے اُس کا ایک ہلکا سا اندازہ اُس مضمون سے لگایا جا سکتا ہے جو ترجمان القرآن کی دو گزشتہ اشاعتوں میں "پاکستان میں عیسائیت کی رفتارِ ترقی" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ اس قابل قدر مقالہ کے فاضل مرتب نے اپنے دعوے کی تائید اُن اعداد و شمار سے کی ہے جو انہیں مسیحیت کے پرچاریوں نے ہی فراہم کیے ہیں۔ اس بنا پر اس مضمون کے مندرجات کو محض "سنسنی خیز" کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسا ملک جسے اسلام اور صرف اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ جس کی بنیادوں میں لاتعداد معصوم بچوں بچیوں کی ہڈیاں اور کھوپڑیاں دفن ہوں جس کی تعمیر میں اَن گنت بے گناہوں کا خون بطور گارے کے استعمال ہوا ہو اور جس کے حصول کے لیے مسلم قوم کی بے شمار عفتیں اور عصمتیں لٹی ہوں اور دو چار دس بیس نہیں بلکہ پورے چار کروڑ بھائی بندوں کو وحشت اور درندگی کے رحم و کرم پر چھوڑنا پڑا ہو، اسلام کے عین اس حصار کے اندر اگر کچھ دشمن شبخون مارنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے زیادہ چونکا دینے والی خبر اور کون سی ہو سکتی ہے۔ یہ افسوسناک صورتِ حال گہرے غور و فکر کی محتاج ہے اور اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے اس خطرہ کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آخر وہ مسیحی مبلغین جنہیں دو سو سال تک انگریزی امپریلزم کی تائید و حمایت حاصل رہی وہ اس وقت تو ناکام رہے اور اب جبکہ امپیریلزم یہاں سے رخصت ہو چکا ہے تو اپنے ناپاک ارادوں میں وہ کامیاب ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان اسباب و وجوہ پر بھی غور کرنا چاہیے جن کی بنا پر مسلمان مسیحیت کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ یہ معاملہ کوئی ایسا نہیں جسے محض حادثہ سمجھ کر چھوڑ دیا جاتے۔ حالات کے اندر اس افسوسناک تبدیلی کے کچھ وجوہ ہیں۔ وہ قوم جس نے

انگریز کی جباری اور قہاری کا پورے دو سو برس تک ڈٹ کر مقابلہ کیا اور صرف چند طالع آزما افراد کو چھوڑ کر اس کے ہر رکن نے غیر ملکی اقتدار کے سامنے بڑی پامردی دکھائی، اس کی صفوں میں اب آزاد ہونے کے بعد کیوں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ یہ وقت تو وہ ہے کہ پاکستان سے اسلام کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر اُن ممالک کو منور کریں جہاں باطل کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھاتے ہوتے ہیں مگر عملی طور سے ہو یہ رہا ہے کہ اس خطہ پاک ہی میں کفر کے سایے بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتے جا رہے ہیں۔ اس غیر متوقع صورتِ حال کا تجزیہ اشد ضروری ہے۔

ہمارے نزدیک انگریزی عہدِ اقتدار میں مسیحیت کی ناکامی کے دو بڑے سبب ہیں۔ انگریز نے عیسائیت کا مؤید اور حامی ہونے کے باوجود بعض سیاسی مصالح کے تحت عیسائی مشنریوں کو کام کرنے کی اتنی مکمل چھوٹ نہ دے رکھی تھی جتنی آزاد ہونے کے بعد مسلمان فرمانرواؤں نے انہیں دے دی ہے۔ خصوصاً غدر کے بعد غیر ملکی سامراج مذہب کے معاملے میں غیر معمولی حد تک محتاط ہو چکا تھا۔ اُسے اس امر کا پوری طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ مذہب کے متعلق اہلِ ہند اور خاص طور پر مسلمانوں کے احساسات بڑے نازک ہیں اس لیے وہ ہر ایسا قدم اٹھانے سے گھبراتا جس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے مجروح ہونے کا خطرہ ہو۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ عیسائی مبلغین اس ملک میں جو حرکات بھی کریں گے اُس کا ذمہ دار انگریز کو ہی ٹھہرایا جائے گا۔ وہ ان کی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کا خواہاں تو تھا اور اس راہ میں ہر قسم کی اعانت بھی کرتا مگر اس بات کا خاص خیال رکھتا کہ کہیں یہ سرگرمیاں لوگوں کو مشتعل کر کے اُس کے اقتدار کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ نہ بن جائیں۔ لہٰذا محض حفاظتی تدبیر کے طور پر وہ ان سرگرمیوں کو ایک خاص دائرے سے باہر نہ نکلنے دیتا تھا۔

آزاد ہونے کے بعد اب جبکہ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے تو وہ محض اس ڈر سے

کہ اُن پر تعصب اور تنگ نظری کا الزام نہ لگ جائے ان مشنریوں کو ایسی مراعات دی گئی ہیں جو انہیں خود اپنے دورِ اقتدار میں بھی حاصل نہ تھیں۔ یہ ایک نفسیاتی عارضہ ہے جس سے ہم جتنی جلدی خلاصی پالیں اتنا ہی ہمارے حق میں مفید ہو گا۔ صرف "روشن خیال" اور "روادار" کہلانے کے لالچ میں اگر ہم دوسروں کو اپنے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی اجازت دے دیں تو اس سے زیادہ اور کونسی حماقت ہو گی؟ "رواداری" بے شک بڑی پسندیدہ صفت ہے لیکن یہ اُسی صورت میں قابلِ ستائش ہے جب اس سے قومی زیاں نہ ہوتا ہو مگر جب اس رواداری سے فائدہ اٹھا کر غیر ملکی سامراج ہماری جڑوں کو ہی اکھاڑنے کے درپے ہو جائے اُس وقت اس بیجا رواداری کا مظاہرہ کرنا شرافت نہیں بلکہ سراسر بے غیرتی ہے۔

ممکن ہے ہماری ان گزارشات کے متعلق کوئی صاحب یہ کہیں کہ یہ مسیحی مبلغین دوسرے غیر مسلم ممالک میں بھی تو کام کر رہے ہیں۔ اگر وہاں انہیں کوئی زیادہ خطرہ نہیں سمجھا جاتا تو مسلمانوں کے لیے یہ کیوں خطرناک ہیں۔ اس ضمن میں یہ ذہن نشین رہے کہ دنیا کی تمام آزاد قومیں ان مسیحی مشنریوں کی سرگرمیوں کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ہمارے بڑے پڑوسی ملک ہندوستان میں جس طرح ان مبلغین کی حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی کی جا رہی ہے اُس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ ان کی "معصوم سرگرمیوں" کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ مسیحی مشنریوں کی کارگزاریاں ہر جگہ وجہِ اضطراب ہیں کیونکہ گزشتہ تین سو برس کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ امپیریلزم اور مسیحی مشن کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یورپین امپیریلزم نے مختلف طریقوں سے مشرقی ممالک میں نفوذ کیا ہے۔ کہیں تو اُس نے فوج کشی کر کے لوگوں کو زیر کیا اور پھر ان مشنریوں کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ تعلیم کے ذریعے ان گرفتاروں کے دل و دماغ میں اس طرح کی تبدیلیاں پیدا کریں کہ وہ خود غلامی پر راضی ہو جائیں اور اُن کے اندر کبھی بھی آزادی کا احساس اُبھرنے نہ پائے اور جب امپیریلزم کو حالات کے تحت اپنی فوجیں

ان ممالک سے ہٹانی پڑیں تو پھر یہ مشنری اور اُن کے یہ بھی خواہ ان خطوں میں غیر ملکی مفادات کی حفاظت اور پاسبانی کر سکیں۔ چنانچہ ان مشنریوں نے اپنی چالاکی اور عیاری سے یورپین امپیریلزم کے لیے بعض ایسی خدمات سرانجام دی ہیں جو لشکر و سپاہ کے لیے قریب قریب ناممکن تھیں۔ کئی مقامات پر یہ مشنری ہراول دستے کے طور پر پہنچے اور سامراج کے لیے زمین ہموار کی۔ اس بنا پر ان لوگوں کی سرگرمیوں کو "خدمتِ خلق" سے تعبیر کرنا افسوسناک جہالت ہے۔ ان مسیحی مبلغین کے "معصومانہ کارناموں" کی صحیح نوعیت معلوم کرنے کے لیے آپ ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی اور ڈاکٹر عمر فروخ کی مشہور تصنیف "التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیۃ" کا مطالعہ کریں اس سے آپ کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ یہ لوگ تعلیم اور شفاخانوں کی آڑ میں کس مذہب" کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔ اس فاضلانہ تصنیف کے پہلے باب میں انہوں نے ناقابلِ تردید دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان مبلغین کی سعی و جہد کا مقصد مسیحیت کی اشاعت نہیں بلکہ استعماریت کی توسیع و ترقی ہے۔ چنانچہ ان مشنریوں میں بعض ایسے من چلے تبلیغ مذہب کے لیے دوسرے ممالک میں نکل پڑتے ہیں جو خود سرے سے کسی مذہب پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ یورپ کے بعض ممالک فرانس، المانیہ وغیرہ کے عیسائی مشنری خواہ اپنے حکام سے کتنے ہی نالاں ہوں مگر نو آبادیات کے معاملے میں اپنے ملک کی پالیسی سے سو فیصد متفق رہتے ہیں۔ یہ ممالک بھی اختلاف کے باوجود ان مبلغین کی پوری پوری سرپرستی فرماتے ہیں۔ فسطائی نظام کے حامی اٹلی نے اپنے ملک میں ایک مثالی گرجا تعمیر کرایا جو استعماری سیاست کی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ روس نے جو دین اور مذہب کا سخت دشمن ہے اس نے بھی اپنے استعماری پنجوں کو مشرقی ممالک میں گاڑنے کے لیے انہیں مسیحی مبلغین کی خدمات حاصل کیں۔ چنانچہ اس عظیم مقصد" کے لیے ماسکو میں ایک مذہبی کانفرنس منعقد کرائی گئی جس میں اسٹالن نے بہ نفسِ نفیس شرکت کی اور مسیحی مشنریوں کو آشیرباد دیتے ہوئے انہیں دوسرے ممالک میں تبلیغِ مذہب کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے ان مشنریوں کو خدا ترس لوگوں کا ایک مقدس گروہ سمجھ کر ان کی حرکات و سکنات سے صرفِ نظر کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔

ان لوگوں کی سرگرمیاں خصوصاً مسلم قوم کے لیے بعض دوسرے اسباب کی بنا پر بھی وجہ اضطراب ہیں۔ وہ قومیں جن کی قومیت کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ رنگ، نسل یا وطن ہے اُن کے لیے بعض لوگوں کا ایک مذہب کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرنا کچھ زیادہ تشویشناک نہیں ہوتا۔ اس تبدیلی سے اُن کی قومیت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا مگر مسلم قوم کی اپنے مذہب کے ساتھ تعلق کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔ مذہب اس قوم کے افراد کے لیے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ایک شعبہ نہیں، جس کا مقصد صرف مذہبی احساسات و جذبات کی تسکین ہو، یا جس کے ذریعہ لوگ ایک غیر محسوس اور غیر مرئی ذات کے ساتھ ایک طرح کا تعلق خاطر قائم کر سکیں۔ امتِ مسلمہ کے لیے مذہب ہی اس کا مبدأ حیات اور زندگی کی اساس ہے۔ اسی سے اُس کی قومیت تشکیل پاتی ہے، اور اسی کی محبت اُس کے اندر زندہ رہنے کی تڑپ اور آگے بڑھنے کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ یہی حصار اُسے دوسری قوموں کے حملوں سے محفوظ رکھتا ہے چنانچہ اس امت کے اندر مذہب کی تبدیلی بہت دُور رس نتائج کی حامل ہے۔ یہاں جو شخص ایک مذہب کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرتا ہے۔ وہ صرف چند عقائد اور عبادات کا تارک ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی قومیت سے بغاوت کرتا ہے اور یہاں جن لوگوں کو ایسے کام کرنے کی رعایت دی جاتی ہے یوں سمجھیے کہ انہیں ملک اور قوم کو منہدم کرنے کا لائسنس ملتا ہے۔ اس بنا پر جس طرح انگریز ہر اس فرد اور گروہ کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اسے انگلستان کا باغی بناتے اور اس کی کسی حرکت کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح ایک مسلمان بھی اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص یا ادارہ امتِ مسلمہ کے کسی فرد کو بہکا کر اسلام سے برگشتہ کرے۔ ایک محب الوطن جرمن کو جتنا اپنا ملک جرمنی عزیز ہے۔ اس سے کہیں زیادہ عزیز ایک مسلمان کے لیے اسلام ہے، یہ دین اُس کے لیے نہ صرف اس دنیا میں فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے بلکہ اُس کی اُخروی نجات بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اور وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی معاملے میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس پر کسی قسم کی آنچ ایک سچے اور مخلص مسلمان کے لیے قیامت سے

کم نہیں۔

پھر پاکستان میں تو قومیت کی تشکیل میں سارا عمل دخل صرف اسلام کا ہے۔ دین کی بنیاد پر ہی اس ملک کو حاصل کیا گیا۔ اس کے مطالبہ کی اگر کوئی جائز اور معقول وجہ ہو سکتی تھی تو صرف یہی تھی کہ ہم اپنی مذہبی زندگی اور دنیاوی زندگی کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہیں کھینچ سکتے۔ دین ہماری زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ اس بنا پر ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم مسلمان رہتے ہوئے اپنی زندگی کے کسی حصے میں دین کو نظر انداز کر دیں۔ دین ہی ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان نشانِ امتیاز ہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد اس کے مائل بہ انتشار اجزا کو اگر کوئی چیز آپس میں جوڑے ہوئے ہے تو اسلام ہی ہے۔ اسلام کے علاوہ ہمارے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہو، ہم ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتے ہمارے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہماری زبانیں ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں اور اُن کے درمیان بسا اوقات اتنا اختلاف نظر آتا ہے کہ انہیں ایک سانچہ میں ڈھالنا قریب قریب ناممکن ہے، سوائے اسلام کی تاریخی روایات کے ہمارے قومی پس منظر میں بھی کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو ہمارے اندر ایک قوم ہونے کا احساس پیدا کر سکے، پھر جغرافیائی تعلق جسے قومیت کی تشکیل میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے، وہ بھی ہمارے ہاں ناپید ہے۔ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ ہے۔ اس فاصلہ کی وجہ سے دونوں خطّوں کے باشندوں کے درمیان جو بُعد اور دُوری موجود ہے، اُس سے کوئی ہوشمند انسان ناواقف نہیں۔ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی جو قوت ہمیں ایک دوسرے سے مربوط رکھ رہی ہے وہ اسلام کی محبت ہے۔ آپ خود ہی غور کریں کہ اگر ہم نے اس مقناطیسی قوت کو جس نے ہماری قوم کے مختلف بلکہ متضاد عناصر کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے، یونہی "رواداری" کے جنون میں ضائع کر دیا

تو ہمارا حشر کیا ہو گا۔

اس سلسلہ میں ہمیں اس حقیقت کو بھی پوری طرح نگاہ میں رکھنا چاہیے اگر ہم فی الواقع پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں اور اس ریاست کو دین کی خادم ریاست بنانے کے متمنی ہیں تو پھر ہمارے لیے یہ چیز اشد ضروری ہے کہ ہم عوام کے دینی اور مذہبی رجحانات کے معاملے میں انتہائی تدبّر اور تفکر کا ثبوت دیں۔ اگر ہم نے اپنی غفلت سے اپنی آئیڈیالوجی کو جو درحقیقت ہمارے لیے رگِ جان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک غیر سنجیدہ سی چیز سمجھ کر اس کے ساتھ کھیل تماشہ کا سا معاملہ شروع کر دیا تو پھر ہمارے ذہنوں میں ایک ایسا خوفناک انتشار پیدا ہو گا جو ہماری نوخیز نسلوں کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیگا۔ اُن کے فکری جہاز پھر بالکل بے لنگر ہو جائیں گے اور مفادات کے تھپیڑے انہیں جس طرف چاہیں گے بڑی آسانی کے ساتھ بہا کرلے جائیں گے۔ دنیا کی کوئی قوم جس کے اندر زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا جذبہ موجود ہو وہ اپنی آئیڈیالوجی کے معاملے میں اتنی بے حس اور بے پروا نہیں ہوتی جس کا ہم گزشتہ ۲۱ برس سے عملی طور پر مظاہرہ کر رہے ہیں آئیڈیالوجی کا تعلق صرف دماغ سے نہیں ہوتا بلکہ جذبات و احساسات سے ہوتا ہے اور اگر کوئی قوم احساسات کے اعتبار سے ایک مرتبہ اپنے اصل موقف سے ہٹ جائے تو پھر اُسے واپس لانا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔

آئیے اب ایک نظر اُن اسباب پر بھی ڈال لیں جن کی وجہ سے عیسائیت کو مغربی استعمار کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کے بعد پاکستان میں فروغ ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت میں تاریخ کا ایک بڑا المناک سانحہ ہے کہ جو مذہب حکومت کی تائید اور حمایت کے باوجود لوگوں میں بالکل نفوذ نہ کر سکا وہ اب اقتدار کے ہٹنے کے بعد عوام میں اپنی راہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے اس کی ایک وجہ تو انگریز کی وہ سیاسی پالیسی ہے جس کی طرف ہم نے گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے

کہ غیر ملکی حکمران بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اس چیز کو خطرناک سمجھتے تھے کہ لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتے۔ وہ جانتے تھے کہ اہلِ ہند کے مذہب کے معاملے میں احساسات نازک ہیں اور اگر لوگوں نے حکمرانوں کے مذہب کو قبول کرنا شروع کر دیا تو اس سے عوام کے اندر نفرت اور بغاوت کے شدید جذبات پیدا ہوں گے جو شاید اُن کی سیاسی ناؤ کو ہی ڈبو ڈالیں۔ اس لیے وہ کھُل کر عیسائیت کی سرپرستی کرنے سے برابر احتراز کرتے رہے۔ لیکن اب جبکہ سیاسی اقتدار بالکل ہٹ چکا ہے تو اُن کی حکومت بالکل کھُل کر مسیحی مبلغین کی حمایت کرتی ہے۔ اہلِ مغرب جانتے ہیں کہ یہ مشنری اپنے مقصد میں جتنے کامیاب ہوں گے اُتنا ہی سامراج کو فائدہ حاصل ہو گا اور وہ اس نئی روش کے خطرناک نتائج سے بھی بالکل محفوظ و مامون رہیں گے۔

پھر وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ اقتدار کے ہٹ جانے کے بعد بھی اگر پاکستان کو غلام رکھا جا سکتا ہے۔ اور اُس کی اس کمزور حیثیت سے ناجائز فوائد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے کہ اُن کے اندر اُس دین کی محبت کو ختم کر دیا جائے جو بار بار انہیں غیر ملکی سامراج کے خلاف صف آرا ہونے پر آمادہ کرتا ہے اور اس کی جگہ اُن کی نگاہ میں اُس مذہب کو پرکشش بنایا جاتے جو انہیں غلامی پہ قانع کر دے اور اُن کے دل و دماغ سے علیحدگی کے احساسات کو کھُرچ کھُرچ کر مٹا ڈالے تاکہ وہ آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنے آپ کو غلام ہی سمجھتے رہیں اور اہلِ یورپ اپنے اوپر استعماریت کا کوئی الزام لیے بغیر وہ سارے مقاصد حل کر سکیں جو سیاسی استیلاء کے زمانے میں کرتے رہے تھے۔ یہ ہے وہ اصل وجہ جس کی بنا پر اہلِ مغرب نے ایک سگے بندھے پلان کے تحت اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا ہے اور مسلح افواج کو ہٹا کر "مکتی فوج" کے ٹڈی دل پاکستان میں اتار دیئے ہیں۔ تاکہ یہ "ہیرو" لوگوں کے ضمیر و ایمان کی بستیاں تاخت و تاراج کریں اور مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جن گوشوں میں انگریز دو سال تک اپنی قوت و طاقت کے باوجود نفوذ نہ کر سکا انہیں یہ مبلغین دودھ کے ڈبوں اور پھٹے پرانے کپڑوں کے ذریعہ مسخر کرنے کی کوشش کریں۔

غیر ملکی سامراج کی عیاریاں اور فتنہ سامانیاں درست سہی لیکن ہم بالکل بد دیانت ہونگے اگر ہم اپنی ان کمزوریوں کی نشاندہی نہ کریں جن کی وجہ سے ان مسیحی مبلغین کو اس بات کی ہمت ہوئی ہے کہ وہ ہمیں ایک تر نوالہ سمجھ کر چبانے کے درپے ہیں۔ باہر والوں کی فریب کاریاں ہمارا بالکل کچھ نہ بگاڑ سکتیں اگر داخلی طور پر ہم محتاط اور بیدار مغز ہوتے اور اپنے اندر ان کمزوریوں کو پرورش پانے کا قطعاً کوئی ایسا موقع نہ دیتے جن سے فائدہ اٹھا کر غیر ملکی سامراج ہمارے درپے آزار ہوا ہے۔

ہماری ان کمزوریوں میں سے بڑی کمزوری ہمارا وہ غلط قسم کا احساس رواداری ہے جو ہمارے اندر روشن خیال کہلانے کے لالچ میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے اقلیتوں کے معاملے میں ہم پر بعض ایسی نازک ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن سے عہدہ برا ہونا ہمارا دینی فریضہ ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اس ملک میں اقلیتوں کو بالکل کھلی چھٹی دے دیں کہ وہ جو چاہیں کرتی رہیں اور کوئی اُن سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ اسلام نے جہاں ہم سے اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے وہاں اُس نے اُن کی سرگرمیوں کی بھی کچھ حدود و قیود مقرر کی ہیں۔ ہم نے محض اس خوف سے کہ کہیں ہم پر متعصب ہونے کا الزام نہ چپک جاتے اُن لوگوں کو بعض ایسی مراعات دے رکھی ہیں جو نہ تو اسلامی نقطۂ نظر سے پسندیدہ ہیں اور نہ ہی دنیا کا کوئی دستور انہیں مبنی بر انصاف سمجھتا ہے۔ اس بنا پر ہمارا پہلا فرض ہے کہ ہم اقلیتوں کے جان، مال، عزت و آبرو اور اُن کے پرسنل لاکی تو پوری مستعدی کے ساتھ حفاظت اور پاسبانی کریں لیکن انہیں اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ لوگوں کو دنیاوی مال و متاع کا لالچ دے دے کر اسلام سے برگشتہ کرتے رہیں۔

ہماری دوسری کمزوری وہ غلامانہ نقطۂ نظر ہے جو ہم نے مغربی تہذیب کے متعلق قائم کر رکھا ہے۔ اس ملک کو ہم نے اسلام کے نام پر لیا تھا اس لیے یہاں کے عوام بجا طور پر اس بات کی توقع رکھتے

تھے کہ غیر ملکی سامراج کے ہٹنے کے بعد یہاں اسلامی اقدارِ حیات کو فروغ ہوگا، یہاں اُن بھلائیوں کی نشر و اشاعت کی جائے گی جو اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہیں اور اُن برائیوں کا قلع قمع ہوگا جنہیں اسلام دنیا سے مٹانا چاہتا ہے۔ لوگوں کے قلب و نگاہ کے زاویے بدلیں گے اور اُن کے دل میں اسلامی تعلیمات کا احترام پیدا ہوگا۔ اس طرح یہ ملک بہت جلد ہی اسلامی تہذیب و تمدّن کا گہوارہ بنے گا لیکن " اے بسا آرزو کہ خاک شدہ " ۔ اس مایوسی نے لوگوں کے اندر احساسِ شکست پیدا کر دیا ہے۔ ہماری نوخیز نسلیں اب اسی انداز پر سوچنے لگی ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن بہر حال ہماری اپنی تہذیب سے بہتر ہے۔ اسی لیے ہمارے اربابِ بست و کشاد ملک کی فلاح کے پیشِ نظر اس غیر ملکی تمدّن کو اپنانے پر مُصر ہیں۔ چونکہ ہم نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کی غلامی کا جُوا اپنے کندھوں سے نہیں پھینکا بلکہ اسے ایک بیش قیمت ورثہ سمجھ کر سینے سے لگائے ہوتے ہیں۔ اس لیے مغربی اقدارِ حیات کی عزت بھی ہماری نگاہوں میں مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مغرب کی پیروی میں دین کو اپنی زندگی میں ازخود ایک ضمیمے کی حیثیت سے شامل کرنے لگے ہیں اور جو چیز ایک انسان کے لیے مبدأ حیات نہ ہو بلکہ محض ایک زائد سی چیز ہو اُس کی تبدیلی اُس پر قطعاً شاق نہیں گزرتی۔

اس کے علاوہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جس سرعت کے ساتھ مغربی سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے اُس میں ایک ایسے دین کا اپنانا قریب قریب ناممکن سا ہو گیا ہے جو زندگی کے ہر پہلو کے لیے ایک واضح ہدایت پیش کرتا ہو۔ اس روش سے لوگوں کے دل و دماغ میں ایک ایسی کشمکش پرورش پا رہی ہے جس نے اُن کے سارے فکری اور عملی قویٰ کو مضمحل کر دیا ہے۔ پاکستان کی عظیم اکثریت اس دنیا اور آخرت کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتی ہے اور یہ نقطۂ نظر اُس کی ساری زندگی پر حاوی ہے لیکن وہ اپنے اردگرد ایک ایسا ماحول پا رہی ہے جو اُس کے اس بنیادی نقطۂ نظر کی ہر قدم پر مزاحمت کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں سے چند

"مجنون" تو کچھ دیر اس ماحول کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنے اس بنیادی نقطۂ نظر کے تقاضوں کے مطابق وقت بسر کرنے کی سعی کرتے ہیں لیکن جو لوگ اس کشمکش کے لیے اپنے اندر ہمت نہیں پاتے وہ جلد ہی ایک ایسے مذہب کی تلاش شروع کر دیتے ہیں جو ان کے ضمیر اور ماحول کے درمیان مصالحت کرا دے۔ ان میں سے کچھ افراد اسلام کے اندر بعض بنیادی تبدیلیاں کر کے اس مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں اور جو ذرا مغرب پر زیادہ فریفتہ ہیں وہ اُس دین کو سرے سے خیرباد کہتے ہیں جس نے اُن کے اندر اس ذہنی کشمکش کو پیدا کر کے اُن کے "ترقی کے" راستوں کو مسدود کر رکھا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اہلِ مغرب کو ہمیں عیسائی بنانے سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی کہ ہمیں "مہذب" بنانے سے ہے کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اس قوم کو "مہذب" بنا کر وہ اپنا جتنا اُلو سیدھا کر سکتے ہیں وہ عیسائی بنا کر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ امریکہ کے ایک نامور پادری اور وہاں کی ایک مشہور یونیورسٹی کے رئیس نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا:

> "ممکن ہے ہمارے مبلّغین مسلمانوں کی معتد بہ تعداد کو نصرانی بنانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے ہوں لیکن انہوں نے ایک عظیم اکثریت کو مہذب ضرور بنا دیا ہے اور اب اُن کے اندر ترقی پسندی کے رجحانات بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں[1]"

اسی طرح ایک دوسری تصنیف میں جس میں مسیحی مبلّغین کی ناکامیوں کا جائزہ لیکر انہیں از سرِ نو اپنے دستے مرتب کرنے کی تلقین کی گئی ہے اُس میں نہایت زوردار الفاظ میں انہیں اس بات کا مشورہ دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان نصرانیت قبول نہیں کرتے تو کوئی پروا نہیں تم اپنا کام جاری رکھو اور اُن کے دلوں میں اسلام کے متعلق مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرتے رہو اگر تم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو یہ تمہاری عظیم فتح ہوگی۔ تم ان لوگوں کو عیسائی بنائے بغیر ان سے عیسائیت کی ایسی خدمت لے سکو گے جو شاید خود عیسائی بھی اپنے مذہب کے لیے نہ

[1] بحوالہ التبشیر والاستعمار ص۱۲

کر سکیں۔ اور اس غرض کے لیے اگر انہیں مسیحی اصولوں کے اندر کچھ لچک بھی پیدا کرنی پڑے تو بلا تکلف پیدا کر دو۔[1]

مغربی تہذیب و تمدن کے علاوہ اس ملک میں نصرانیت کو فروغ دینے والی چیز یہاں کا نظامِ تعلیم ہے۔ آزادی سے پہلے جو لوگ اپنے بچوں کو انگریزی مدارس میں بھیجا کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ وہ انہیں کس آگ میں جھونک رہے ہیں۔ اس لیے وہ اس کے بُرے نتائج کے تدارک کی بھی برابر فکر کرتے۔ بچے بھی اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہوتے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں جبر و اکراہ سے کر رہے ہیں اس لیے اُن کے دلوں کے اندر انگریز کے لاتے ہوئے افکار و نظریات سے کوئی محبت نہ پیدا ہوتی تھی بلکہ وہ بسا اوقات ان سے شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے۔

مگر اب جب کہ ملک آزاد ہو گیا ہے تو اُس بوسیدہ نظامِ تعلیم کے بقا اور اس کے استحکام کے یہ معنی ہیں کہ ہم فی الواقع ان نظریات و افکار کو ہی صحیح سمجھتے ہیں اس لیے انہیں اپنے ملک میں اپنی دولت اور قوت کے صرف کے ساتھ فروغ دے رہے ہیں۔ ہماری یہ روش ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں مغرب کے متعلق ایک ذہنی مرعوبیت پیدا کر رہی ہے جس سے مسیحیت کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔

پھر اس نظامِ تعلیم کے مختلف شعبوں کے درمیان اتنا تضاد ہے کہ اس سے جو نوجوان فارغ ہو کر نکلتے ہیں اُن کے اندر فکری اعتبار سے اتنا انتشار ہوتا ہے کہ وہ کسی کلچر کی خدمت نہیں کر سکتے۔ مغربی افکار و نظریات کے ساتھ اسلامیات کا نہایت ہی بھونڈا پیوند بچّوں کے ذہنوں کو سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتوں سے محروم کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جس طرح تلاشِ معاش کے لیے در در کے دھکے کھاتے پھرتے ہیں بالکل اسی طرح نظری اعتبار سے مختلف کوچوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں۔ صبح اگر وہ اشتراکیت کے حامی ہیں تو شام کو وہ

[1] بحوالہ التبشیر والاستعمار صفحہ ۴۲

سرمایہ داری کے حق میں رطب اللسان ہونگے۔ ایک مسئلہ میں اگر اسلام اُن کے لیے پُرکشش ہے تو دوسرے بلشمار مسائل میں وہ مغرب کے مقلدین ہیں۔ اُن حضرات کی ساری عمر مختلف بلکہ متضاد افکار و نظریات کا ملغوبہ تیار کرنے میں گزر جاتی ہے اور وہ قوم اور ملت کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس صورتِ حال سے بھی براہِ راست فائدہ عیسائیت کو ہی پہنچا ہے۔

ان درس گاہوں میں شاید ملت کے لیے سب سے زیادہ خطرناک وہ درسگاہیں ہیں جنہیں کانونٹ سکول یا یورپین ٹائپ سکول کہا جاتا ہے۔ انہیں تعلیمی ادارے کہنا ہی تعلیم کی توہین ہے، یہ فی الحقیقت اس ملک میں عیسائیت کے اڈے ہیں جہاں مسیحی مبلغین کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ان سکولوں کا پورا ماحول مغربی ہوتا ہے۔ فکر و نظر سے لے کر لباس، آداب و اطوار میں سے کوئی چیز بھی ایسی نظر نہیں آتی جس پر مغربی تہذیب و تمدن کی گہری چھاپ نہ ہو۔ اس لیے جو بچے ان قتل گاہوں سے نکلتے ہیں وہ سوائے رنگ اور نسل کے ہر لحاظ سے انگریز ہوتے ہیں۔ اُن کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز، ان کے گفتگو کرنے کا طریقہ اُن کی زبان، اُن کی نشست و برخاست، ان کا معیارِ خیر و شر، اُن کی اخلاقی اقدار اور اُن کے مشاغل الغرض ان کی زندگی کا کوئی شعبہ اور اُن کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں ہوتا جن سے وہ پورے فرنگی معلوم نہ ہوتے ہوں۔ ایک ملک کے لیے اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جن نوخیز نسلوں سے قوم یہ امیدیں وابستہ رکھے کہ وہ کل بڑی ہو کر اپنے دین و ملت کی خدمت کریں گی انہیں غیر ملکی سامراج کی گود میں خود ڈال دیا جائے تاکہ وہ حسبِ منشا ان کے دلوں سے اسلام کے ہر احساس کو مٹا دے اور اُن کی جگہ اُن کے قلب و دماغ میں مغرب کی خدا نفت اور برتری کا نقش ثبت کر دے اور پھر یہ قوم اتنی احمق ہو کہ اس "روحانی ارتداد" اور "ذہنی شبخون" کے لیے زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرنے پر راضی ہو جائے بلکہ اس "خدمتِ جلیلہ" کو وہ اپنی بہت بڑی سعادت خیال کرے۔

ہمارے اس ملک کے اندر جس قسم کے معاشرتی نظام کو ڈھالا جا رہا ہے، اُس کا لازمی تقاضا ہے کہ لوگ اب اپنے ذہین بچوں کو ان عیسائی مشنریوں کے سکولوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھیج کر انہیں لامذہب بنائیں۔ یہاں سول سروس کے اندر انہیں لوگوں کی زیادہ پذیرائی ہوتی ہے جو انگریزی لہجہ میں گفتگو کرنے کے علاوہ آداب، طرزِ رہائش اور مشاغل میں سو فی صد انگریز ہوں۔ وہ اپنی قوم کے احساسات اور جذبات کے معاملے میں جتنا زیادہ فرنگیانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کریں گے اتنا ہی اُن پر ترقی کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ اس صورتِ حال کا فطری نتیجہ یہی ہے کہ جو لوگ بھی اپنے بچوں کو اعلیٰ ملازمتوں کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں وہ انہیں اُن درسگاہوں کے حوالے کرتے ہیں۔ جہاں ان مطلوبہ صفات کو ترقی دینے اور پرورش کرنے کے زیادہ سے زیادہ بہتر انتظامات ہیں۔ اس بنا پر بھی ان عیسائی مشنریوں کو قوم کے ذہین بچوں میں کام کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو رہے ہیں اور یہ لوگ ان سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں بلکہ انہیں ملک و ملّت سے بھی کافی حد تک بیگانہ کر دیا ہے۔

مسیحیت کو جس راستے سے امّتِ مسلمہ کے اندر غالباً سب سے زیادہ بہتر طریق سے نفوذ کا موقع ملا ہے وہ زبان کا راستہ ہے۔ میکالے نے آغاز ہی سے اس راہ کی آسانیوں کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا وہ جانتا تھا کہ یہ وہ راستہ ہے جس سے لوگوں کو کسی دقّت کے بغیر مغربی تہذیب اور اُس کے مذہب کا پرستار بنایا جا سکتا ہے اور لوگوں کے اندر اپنی اس ذہنی تبدیلی کا کبھی احساس بھی پیدا نہ ہونے پائے گا۔ کسی قوم کی زبان محض اس کے افراد کے درمیان اظہارِ خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی وساطت سے افراد کے ذہنی پس منظر تیار ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں اپنی روایات کے ساتھ گونا گوں محبت پیدا ہوتی ہے۔ انگریزی بے جان الفاظ کا ہی مجموعہ نہیں بلکہ اس کے استعاروں اور اس کی تشبیہات میں انگریزی قوم کی پوری تاریخ اور روایات لپٹی پڑی ہیں۔ اس کی شاعری میں اس قوم کے مابعد الطبیعی عقاید سموئے ہوئے ہیں

آپ اس زبان کا اس کے پسِ منظر علائق سے الگ کر کے مطالعہ نہیں کر سکتے۔ جب بھی ہم نوخیز نسلوں کو اس زبان کے ذریعہ تعلیم دیں گے تو ان کے ذہنی پس منظر میں وہی چیزیں منقش ہوں گی جو اس زبان سے وابستہ ہیں۔ اسی زبان کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے انگریزی کے ایک نہایت ہی فاضل استاد نے ارشاد فرمایا ہے۔

"جس زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اس کے بعض پس منظر علائق ہوتے ہیں جو خود بخود تعلیم میں شامل ہو جاتے ہیں۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو، ارضیات ہو یا جغرافیہ، نفسیات ہو یا فلسفہ، معاشیات ہو یا تاریخ، اگر ذریعۂ بیان انگریزی ہے تو جو روایات انگریزی زبان کی ہیں پس منظر میں وہ آپ سے آپ شامل ہو جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ذہنیتیں نیم انگریز یا کم از کم ۵ فیصد انگریز تو ضرور ہوتی جا رہی ہیں۔ انگریزی کا ذریعۂ تعلیم ہونا ہمارے مسلمان بننے میں حارج ہو رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ چند برس پہلے کیمبرج یونیورسٹی میں وہاں کے انگریزی کے سب سے بڑے پروفیسر نے کہا کہ کوئی شخص جو عیسائی نہیں ہے وہ انگریزی شاعری کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان کا پس منظر کچھ تو وہ ہے جسے PAGAN کہتے ہیں یعنی کافرانہ"۔ ان معنوں میں کہ یونان اور روما شمالی سکنڈے نیویا کی روایات پر اس زبان کی بنیاد ہے اور اس نے انہیں زندہ کر رکھا ہے، انگریزی زبان کی دوسری بنیاد جس میں (مذہبی) روایات ہیں اور تیسری بنیاد جدید سائنٹفک روایات ۔۔ نشاۃ ثانیہ کے وقت سے لیکر آج تک ۔۔ یہی تینوں روایتیں انگریزی زبان کی تشکیل و ترویج کی ذمہ دار ہیں جب ہم انگریزی پڑھتے ہیں تو غیر محسوس طور پر یہ تینوں روایتیں ہمارے ذہن کو متاثر کرتی ہیں ہماری ذہنیت کو خاص سانچوں میں ڈھالتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ہمارا ذہنی پس منظر فارسی، عربی اور اردو کی روشنی میں ڈھلے خواہ ہم طبقات الارض پڑھیں خواہ جغرافیہ، چاہے تاریخ انگلستان۔ ان علوم کا اردو میں ہونا ہی ہمیں اسلامی روایات

کے قریب لائے گا"۔[۱]

یہ الفاظ کسی کٹھ ملّا کے نہیں جنہیں محض "رجعت پسندی" کہکر نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اُس فاضل استاد کے ہیں جو برسوں کیمبرج یونیورسٹی میں رہا اور جو قریب قریب ربع صدی سے اس ملک میں انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اس بات کا بڑی آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام سے دُور کرنے اور مسیحیت سے قریب کرنے میں انگریزی زبان کو کتنا دخل حاصل ہے۔

یہ تو ہیں مختصر طور پر وہ بالواسطہ اسباب جن کی بنا پر پاکستان میں نصرانیت کو ترقی کرنے کا موقع ملا ہے مگر ان اسباب کے ساتھ ساتھ کچھ بلاواسطہ وجوہ بھی شامل ہیں جن کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان اسباب میں سے سب سے پہلا سبب اہلِ پاکستان کی غربت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد کچھ لوگوں پر دھن برسا ہے اور وہ آن کی آن میں انتہائی دولتمند ہو گئے ہیں مگر یہ چیز بھی امر واقعہ ہے کہ یہاں کی عظیم اکثریت لاتعداد معاشی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ غریب طبقوں کے لیے اپنے بچوں کو حسبِ منشا تعلیم دلوانا قریب قریب ناممکن سا ہو گیا ہے۔ اس لیے بعض وہ نوجوان جو اپنی ترقی کی ساری راہیں مسدود پاتے ہیں اور اُن کے اندر دین اور ایمان کی قدر بھی خارجی ماحول کی نامناسبت کی وجہ سے کم ہو جاتی ہے وہ اعلیٰ تعلیم اور بہتر ملازمت کے لالچ میں اسلام کو ہی خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ ان مشنریوں کی درسگاہوں میں مسلمان طلباء کے ساتھ ایک ناروا امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ عیسائی طلباء کو ہر قسم کی مراعات حاصل ہوتی ہیں اور ان کے مقابلے میں مسلمان طلبہ سے بہت زیادہ رقم فیسوں اور جرمانوں کی شکل میں وصول کی جاتی ہے

---

[۱] چراغ راہ، نظریۂ پاکستان نمبر از جناب پروفیسر حمید احمد خان صفحہ ۲۴۶ - ۲۴۷

قریب قریب یہی حال مشن ہسپتالوں کا بھی ہے۔ عیسائی مریضوں سے ایک پیسہ لیے بغیر انہیں بہتر سے بہتر طبی امداد پہنچائی جاتی ہے اور اُن کے مقابلے میں جو مسلمان ان ہسپتالوں کا رخ کرتے ہیں اُن سے اس خدمتِ خلق کا اتنا بھاری معاوضہ وصول کیا جاتا ہے جس کی عام جیبیں متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان اداروں میں عیسائی اور مسلمان کے درمیان یہ امتیازی سلوک اُن لوگوں کے لیے جو نہ تو اسلام کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور نہ ہی اُس کی محبت اُن کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہوتی ہے، ایک کڑی آزمائش اور ایک مستقل فتنہ بن گیا ہے جو انہیں کسی وقت بھی راہِ راست سے ہٹا سکتا ہے۔

پھر "ولایت پلٹ" اور "امریکہ پلٹ" لوگوں کو پاکستان میں ملازمت کی جو سہولتیں حاصل ہیں انہوں نے بھی عیسائیت کے فروغ میں کافی مدد دی ہے۔ "وہ من چلے" جو اگرچہ رہتے تو اس ملک میں ہیں، اسی ملک کا نمک کھاتے ہیں، اسی کی مال و دولت سے مستفید ہوتے ہیں مگر جن کا دل ہمیشہ مغرب میں اٹکا رہتا ہے۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت انہیں باہر بھیجنے اور وہاں تعلیم دلوانے میں اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکتی اور خود اُن کے اپنے وسائل اس "مہم" کے لیے ناکافی ہیں تو وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر عیسائی اداروں کی طرف لپک پڑتے ہیں جو انہیں فوراً اپنی آغوش میں لیکر ان کی دلی تمناؤں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ صاحب بہادر صرف غیر ملکی سیاحت اور "روشن مستقبل" کے فریب میں آکر ایمان جیسی متاعِ عزیز کو داؤں پر لگا دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ "فادر" کو حکام عالی مقام کے ہاں جو عزت و توقیر حاصل ہوتی ہے اس کا بھی عیسائیت کے پھیلنے میں بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں کا مذہبی رہنما بیچارا آج بھی حکام کے نزدیک اتنا ہی مغضوب اور قابلِ نفرت ہے جتنا کہ انگریزی عہد میں تھا۔ انگریز کو اس سے جو

پر خاش تھی اس کی وجوہ تو سمجھ میں آسکتی ہیں ۔ وہ جانتا تھا کہ یہی وہ ذات ہے جو اس کے ناپاک عزائم کے لیے ڈائنامیٹ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے وہ اس سے جو ناروا سلوک کر رہا تھا وہ اس کے استعماری مقاصد کے عین مطابق تھا لیکن انگریز کے رخصت ہو جانے کے بعد اس بیچارے کے نصیب آج تک نہیں جاگے ۔ مسیحی پادری جب چاہے بلا روک ٹوک عیسائیوں کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لیے بڑے سے بڑے حاکم سے بلا تکلف ملاقات کر کے اصلاح حال کے لیے تقاضا کر سکتا ہے ۔ اس کی تکلیفات اور شکایات کو حکومت کے ایوانوں میں پوری توجہ سے سنا جاتا ہے اور انہیں دور کرنے کے لیے بھی تگ و دو ہوتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا مذہبی رہنما آج بھی حکومت کے نزدیک "ناپسندیدہ عنصر" ہے جس کی حکومت کی نظر میں کوئی عزت و توقیر نہیں ۔ اس بیچارے کی کہیں کوئی شنوائی نہیں ہوتی وہ اپنے بھائی بندوں کی تکلیفات سے ارباب بست و کشاد کو آگاہ کرنے سے قاصر ہے اس کی بات پر توجہ کرنے کی بجائے اسے اکثر ہدف استہزاء بنایا جاتا ہے اس بنا پر وہ مسلم معاشرے کی کوئی ایسی خدمت سرانجام نہیں دے سکتا جس سے وہ لوگوں کے دل موہنے میں کامیاب ہو سکے ۔ اسے اپنے گھر کے اندر ہی بے اثر اور اجنبی بنا کر رکھ دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں میں جب کبھی لوگوں کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اس کے ازالہ کے لیے "فادر" کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں اور "فادر" اپنی اس خدمت کے عوض ان سے ان کے ضمیر اور ایمان خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور بہت سے موقعوں پر کامیاب بھی ہو جاتا ہے ۔

پاکستان میں عیسائیت کی رفتارِ ترقی

(جناب سید محمد جمیل صاحب)

(۳)

بہرکیف ہم جس بات کو پورے زور سے واضح کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ پاکستان میں اس بات کی قطعی اجازت نہیں دی جاسکتی اور نہ دی جانی چاہیے کہ لوگوں کے دین وایمان کو دنیوی مال ومتاع کے عوض خریدا جائے اور اس ملک میں بالفعل یا بالقوہ ایک "پانچواں کالم" پیدا کیا جائے جس کی وفاداریاں غیر ملکی طاقتوں سے وابستہ ہوں - اس طریقے سے پوری قوم کی رگِ حیات کو مسموم کیا جارہا ہے۔ مغرب اپنی جگہ پر آزاد ومختار ہے کہ وہ چاہے تو سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھ کر اپنی تہذیب کی قبر خود ہی کھودے۔ مگر ہم مسلمان جنہیں اپنے اسلام پر فخر ہے، اور جنہوں نے اسلام ہی کے جھنڈے تلے جمع ہوکر فقید المثال قربانیاں دی ہیں، اپنے ہاں اسلام سے انحراف کو برداشت نہیں کرسکتے اور نہ ہی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے قومی اور تہذیبی اخلاق کو تہ وبالا ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ارتداد بالاتفاق ایک مجرمانہ فعل ہے، خواہ عیسائی اقوام اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ ہمارے ہاں یہ جرم اسی طرح مستلزم سزا ہے جس طرح امریکہ سے لے کر روس تک کی نام نہاد سیکولر ریاستوں میں سیاسی غداری مستوجبِ سزا ہے۔ اس لیے ریاستِ پاکستان کا یہ مقدس فریضہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں فتنۂ ارتداد کا ہر قیمت پر سدِّ باب کرے، ورنہ جن مسلمانوں کی خاطر پاکستان وجود میں لایا گیا تھا، اُن کی سیاسی سطوت اور تہذیبی انفرادیت کا جنازہ نکل جائیگا اور ان کی قومی خود داری کی بنیادیں بالکل ڈھے جائیں گے۔

اگر اس ملک کی اکثریت کو یہاں امن واطمینان کے ساتھ کسی مزاحمت کے بغیر ریاست کا کاروبار چلانا ہے تو پھر کسی اقلیت کو یہاں اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اکثریت پر

اپنی مرضی محض اس بل پر مسلط کر سکے کہ اُس کی پشت پر غیر ملکی سرمایہ ہے یا بیرونی طاقتیں علانیہ یا درپردہ اس کی پشت پناہ ہیں۔ اس بات کو قطعی طور پر برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا کوئی فرزند اسلام کے نام پر حاصل کی گئی سرزمین میں ان کرایے کے پرچارکوں کے ہاتھوں صلیب کا قلادہ اپنے گلے میں پہن لے جو اجنبی سامان و سرمایہ کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہمارے مفلس اور ناخواندہ عوام کا شکار کرتے پھر رہے ہیں۔ اس معاملے میں اگر کسی وجہ سے ذرہ برابر بھی مصالحت یا تذبذب سے کام لیا گیا تو ہمارا قومی اخلاق تباہ ہو جائے گا اور یہ مملکتِ پاکستان جو ہمارے دیرینہ خوابوں کی تعبیر گاہ ہے، اس کی چولیں بالکل ہل کر رہ جائیں گی۔ ہماری تاریخی روایات یہ ہیں کہ ہم اپنے نظریۂ حیات، اپنے دین اور اپنی عزتِ نفس کی خاطر ہمیشہ لڑتے اور مرتے مارتے رہے ہیں۔ ہمارے اندر خدا کے فضل سے ابھی تک اتنا دم خم موجود ہے کہ ہم دنیا بھر کی دولت کو پائے حقارت سے ٹھکرا سکتے ہیں، اگر اُس سے ہمارے دینی ناموس پر آنچ آرہی ہو۔ اگر پوری قوم کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا جائے کہ محض مادی منفعت کے عوض اُن کا دین ہاتھ سے جا رہا ہے تو انشاء اللہ اس قوم کا ایک ایک فرد پوری آمادگی اور احسان مندی کے جذبے کے ساتھ ہر طرح کے مالی ایثار و قربانی کے لیے اُٹھ کھڑا ہو گا اور اپنے عقائد و ایمان کی محافظت کے لیے کمرِ ہمت باندھے گا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مغرب میں مذہب افراد کی عملی زندگیوں میں کوئی مُؤثر خدمت نہیں سر انجام دے رہا ہے اور بین الاقوامی معاملات میں تو اس کی کارفرمائی قطعاً معدوم ہو چکی ہے۔ اب سوچنے کی بات ہے کہ مغربی اقوام اپنے مذہب کی بیرونی تبلیغ کے لیے کیوں اس درجہ بیتاب ہیں؟ دراصل یہ قومیں تمام تر یا بیشتر کئی صدیوں سے "رنگین اقوام" میں اپنے مذہب کی تبلیغ سیاسی اور استعماری اغراض کے تحت کر رہی ہیں۔ اس تبلیغ کا کام بلا استثنا وہ لوگ سر انجام دے رہے ہیں جو چھوٹی یا بڑی امپیریلسٹ طاقتوں کے آلۂ کار ہیں اور جنہیں اس خدمت کے عوض بیش قرار وظائف مل رہے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء

کی جنگِ آزادی کے وقت یہاں نوے سے مشنری ادارے کام کر رہے تھے اور رومن کیتھولک چرچ کے مشن ان کے ماسوا تھے۔ اہلِ ملک کے مشتعل دینی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ۱۸۵۸ء میں مذہبی ناطرفداری کا ایک شاہی اعلان جاری کیا گیا اور ملک کے گوشے گوشے میں اسے پھیلایا گیا لیکن اس کے ایک ہی سال بعد برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے انگلستان میں یہ بیان دیا:

"یہ محض ہمارا فرض ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے حق میں مفید بھی ہے کہ ہم ہندوستان کے طول و عرض میں عیسائیت کو ہر ممکن طریق سے فروغ دیں۔"

اُس وقت کے وزیرِ ہند نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا:

"ہر نیا عیسائی ایک نیا رابطہ اتحاد ہے جو ہندوستان اور ہمارے ملک کے درمیان وجود میں آتا ہے اور اس سے ہماری سلطنت کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔"

اغیار کی اس حکومت نے مشنری تنظیم کو فقط ایک "رابطہ اتحاد" کے طور پر ہی استعمال نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعے سے اسلام کے علمبرداروں کے مذہبی جذبات کو کچلا گیا، ان کے تہذیبی امتیازات کو ختم کیا گیا اور اس برعظیم میں مسلمانوں کے قومی تشخص پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی گئی۔ تعلیم، سوشل سروس اور ریفارم کے بہانوں سے مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں ہر طرح کا زہر اتارا گیا۔ مسلمان مریض جو مشنری ہسپتالوں میں داخل ہوئے انہیں مسیحی لٹریچر پڑھایا گیا اور مسیحی عبادات میں شریک کیا گیا۔ مشنری سکولوں کو عرصہ دراز تک تعلیم کے میدان میں اجارہ داری حاصل رہی اور تاثر پذیر مسلم بچوں کو اخراج کی دھمکیاں دے دے کر دعاؤں اور پرارتھنا میں شامل کیا گیا۔ افسوس ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد بھی اس طرح کی کارستانیاں کسی نہ کسی درجے میں اب تک جاری ہیں۔ مسلمانوں کو اسلام سے دور ہٹانے اور اس سے متنفر کرنے کی اس ڈیڑھ سو سالہ مہم کے اثرات اب تک ہمارے بعض اعلیٰ انتظامی دوائر میں نمایاں دکھائی دے رہے ہیں۔

عیسائیوں کے اندر جو واضح غیر ملکی وابستگیاں رونما ہوئی ہیں اور نشو ونما پا رہی ہیں۔ انہیں ہندوستان میں محسوس کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں اس امر کے لیے عملی اور قانونی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، جن کے ذریعے سے ان سرگرمیوں کو قابو میں رکھ کر ان پر قدغنیں عائد کی جا رہی ہیں اور عیسائی ہونے والوں کو دوبارہ شدھ کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

پاکستانی عیسائیوں کے اندر جس طرح کے ولولے پرورش پا رہے ہیں ان کی ایک جھلک ذیل کے ایک اقتباس میں دیکھی جا سکتی ہے جو ایک پاکستانی عیسائی مسٹر انتھونی ڈی سوزا کی شائع شدہ دستخطی تقریر سے لیا گیا ہے۔ ضمناً اس تقریر سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس تقریر کے وقت جو لوگ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان میں برسرِ اقتدار تھے وہ کس حد تک ہماری محبوب آئیڈیالوجی اور ہمارے اسلامی تصورِ ریاست کی پامالی کو انگیز کر رہے تھے، بلکہ اس طرح کی مساعی کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور ہر اُس شے کو ملیامیٹ کرنے میں مدد دے رہے تھے جو ایک مسلمان کی زندگی کو قابلِ زیست بنا سکتی ہے۔ اب اقتباس ملاحظہ ہو:

"آج مغربی پاکستان میں عیسائیوں کے پورے پورے گاؤں معرضِ وجود میں آ چکے ہیں اور اُن سے ملک کی زندگی اور ہما ہمی میں اضافہ ہو رہا ہے . . . . اگر انہیں محو کرنے کی کوئی کوشش کی گئی تو بلاشبہ یہ ایک دردناک خسارہ اور بے عقلی کی بات ہوگی"

"اس ملک کے باشندوں کو صرف شہنشاہ پرتگال کی رعایا کی مانند جملہ اور مکمل فوائد ہی حاصل نہیں ہونگے بلکہ وہ دینِ مسیحی کے روحانی منافع و برکات سے بھی متمتع ہونگے۔"

پاکستان نے عیسائی مشنری سرگرمیوں کا خیر مقدم کیا ہے اور اربابِ اقتدار نے ممنونیت کے ساتھ دستِ اعانت آگے بڑھایا ہے۔ عیسائی اقلیت صرف بڑے شہروں ہی میں فعال اور سرگرمِ کار نہیں ہے بلکہ ملک بھر کے دیہات میں، جن میں چھوٹے چھوٹے جھونپڑے اور ڈیرے بھی شامل ہیں، عیسائی مدرس، ڈاکٹر، نرسیں اور قانون دان موجود ہیں۔ ان آبادیوں کی اکثریت کا دارومدار ایسے فنڈز[1] پر ہے جو عیسائی فرقوں کے ساتھ ملحق ہیں اور جن کا کوئی

[1] یہ فنڈ بیرونی ممالک سے درآمد ہوتے ہیں اور ان کی مقدار کئی ملین ڈالر تک پہنچتی ہے۔

بوجھ قومی بجٹ پر نہیں پڑتا ... "۔

"یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ بے شمار عیسائی لڑکیوں نے نرسنگ کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ انسانی ارواح کو اپنے مذہب کے حق میں فتح کرنے کا ایک ذریعہ، جس کے بارے میں نوآباد کاروں کو انتہائی زور دار وعظ پادریوں کی جانب سے پلائے گئے، وہ دیگر اقوام سے شادی بیاہ کا رشتہ ہے۔ چنانچہ بعینہٖ خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے ہیں اور اب پاکستان میں ہماری ایک بڑی قوم وجود میں آچکی ہے۔ اصل معاملہ افراد کی تعداد کا نہیں ہے۔ ایک اقلیت کا مقام اسی وقت محفوظ ہو سکتا ہے جبکہ وہ آزاد[1] اور با اختیار ہو، اور وہ یہ محسوس کر سکے کہ وہ پورے ملک کے لیے عملاً مفید ہے اور ہو سکتی ہے۔ اور اس امر کا یقینی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں یہ مکمل اور بھرپور رابطہ معرضِ وجود میں آرہا ہے۔ عیسائیت کا مستقبل پاکستان میں روشن ہے۔ یہاں کا مسیحی اپنے دوگونہ ورثے کا وارث بن کر آہستہ آہستہ ملی برادری کے اندر اپنا جائز اور طاقتور مقام حاصل کر رہا ہے۔ ایک نسل گزرنے کے بعد ظاہر ہے کہ یہ فرقہ اس سے بہت زیادہ خدمات سرانجام دے گا جتنی کہ وہ اس وقت دے رہا ہے "۔

اوپر کے اقتباسات اس اقلیت کے جارحانہ اور خطرناک دعاوی کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اجنبی روپے اور افراد کے بل بوتے پر کس طرح کی شر انگیز کارروائیوں میں منہمک ہے اور ہماری نوخیز مملکت کے نظریاتی اور تہذیبی تار و پود کو کس طرح بکھیرنے کے درپے ہے۔ اس گروہ کے جس ترجمان کی یہ تقریر ہے وہ ایک سرکاری ملازم ہے اور اُس نے چبا چبا کر بات کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ اپنے اس عزم کا برملا اظہار کیا ہے کہ قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود عیسائی ملک کی زندگی میں ایک طاقتور مقام لینے کا حق رکھتے ہیں اور ایک نسل کے گزرنے گزرتے یہ صورت رونما ہو جائے گی۔

---

[1] آزاد، گویا کہ اس معنیٰ میں کہ وہ اکثریت کی دینی سالمیت کو مجروح کرنے کے لیے خارجی مدد لے سکے!

یہ ناممکن ہے کہ ایک ملت جو زندہ رہنا چاہتی ہو، وہ اس طرح کی شیرینی آمیز اور ملمع شدہ مگر زہریلی گولیاں اپنے حلق سے نیچے اتارے اور خود اپنے ہاتھوں اپنی نظریاتی اور سیاسی موت کو دعوت دے۔ ایسے ملک دنیا میں موجود ہیں جنہوں نے پاکستان سے کہیں زیادہ بیرونی امداد حاصل کی ہے لیکن انہوں نے اپنے مسلکِ زندگی میں بیرونی حکومتوں کی مداخلت کو بڑی سختی اور اصرار کے ساتھ رد کیا ہے۔ ہندوستان، ٹرکی، بلکہ اس سے بھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں مثلاً سوڈان اور مصر وغیرہ نے عیسائی مشنریوں کے خلاف ریاست دشمن ریشہ دوانیوں کی بنا پر مناسب اور ضروری اقدامات کیے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کے مسلم عوام کا تعلق ہے اُن کی دینی حس ان ممالک کی بہ نسبت تیز تر ہے کیونکہ پاکستان کا وجود ہی اسلام کے نام پر عمل میں آیا ہے۔ ہمارے سامنے آزادی کے بعد جب چرچ اس بات کا فخریہ اظہار کرتا ہے کہ اُسے پاکستان میں "عظیم ترین کامیابی" حاصل ہوئی ہے تو یہ چیز ہمارے قلبی احساسات کو اتنا برانگیختہ اور مضطرب کر دیتی ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو مسلمان مسیحیت کی گود میں دھکیلے گئے ہیں اُنہیں دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل کرنا ہر سچے مسلمان کا ایک مقدس فریضہ ہے۔

جو غلطیاں اب تک ہو چکی ہیں ان کی اصلاح کے لیے اور مسیحی تبلیغ کی آڑ میں اپنے ملک و ملت کو بیرونی طاقتوں کی تاخت سے بچانے کی خاطر ذیل میں چند تجاویز حکومت پاکستان کی خدمت میں برائے غور و فکر پیش کی جا رہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جب صحیح واقعات کا پورا علم حکومت کو ہوگا تو وہ اپنا قیمتی وقت اور توجہ اس انتہائی اہم مسئلے پر صرف کرے گی اور ایسے اقدامات اختیار کرے گی جو اس ملک کو اس جانکاہ نقصان سے بچا سکیں گے جو مسیحی پرچار کے طفیل پہنچ رہا ہے اور جس کی نزاکت اور سنگینی کے مستقبل میں بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

(۱) اندرونِ ملک تبلیغی مقاصد کی خاطر کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ مالی مدد باہر سے نہ آنے پائے اور کسی بیرونی مشنری سوسائٹی کو ہماری اجتماعی ہیئت میں مداخلت کا موقع نہ دیا جائے۔

(۲) عام بیرونی امداد صرف حکومتی واسطے سے خرچ کی جائے۔ یہ حکومت ہی کی ذمہ داری ہے

اور ان کے پاس اس کے لیے وافر عملہ موجود ہے۔ اگر حکومت تقاوی قرضے، آلات کشاورزی اور بیج تقسیم کر سکتی ہے اور کروڑوں روپے کی ویلیج ایڈ اسکیمیں عمل میں لا سکتی ہے تو وہ مستحق افراد تک بیرونی عطیات بھی پہنچا سکتی ہے۔ اگر پرائیویٹ اداروں کا استعمال ناگزیر ہو تو صرف ملکی اور سوشلسٹی اداروں مثلاً اسکولوں کے سٹاف وغیرہ سے مدد لی جائے۔

(۳) تعلیمی، طبی یا دوسری قسم کی سہولت و اعانت بہم پہنچاتے وقت کسی طرح کی براہ راست یا بلاواسطہ ترغیب، تبلیغ یا تحریص کی اجازت نہ دی جائے۔

(۴) کسی ملکی یا غیر ملکی کو اس امر کی اجازت نہ ہو کہ وہ پاکستان کے بنیادی نظریہ پر حملہ آور ہو۔

(۵) جس پریس یا پبلشر کی طرف سے کوئی ایسا مواد شائع ہو جس میں اسلام یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سب و شتم ہو، اس کا لائسنس ضبط کر لیا جائے۔

(۶) گزشتہ دس سال میں موجودہ حکومت سے پہلے حکمرانوں یا عوام کی مجرمانہ غفلت کی بنا پر جو مسلمان عیسائی ہوئے ہیں انہیں دوبارہ مسلمان بنانے کے لیے فوری تدابیر عمل میں لائی جائیں۔

(۷) مسلمان عوام کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے فوراً وسیع پیمانے پر اقدامات کیے جائیں، اور اس سلسلے میں سکولوں، کالجوں اور تعلیم بالغاں کے مراکز کو بھی واسطہ بنایا جائے۔

(۸) مساجد کو دینی تعلیم و تدریس کا مرکز بنایا جائے اور ائمہ کے مرتبہ و منزلت کو بلند کر کے ان کی خودداری اور وقار کو بحال کیا جائے، اور مساجد و ائمہ کو حکومت کی وساطت سے اسی طرح امداد دی جائے جس طرح ہندوستان میں چرچ اور اس سے متعلقہ مذہبی محکمے کو برطانوی عہد حکومت میں دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں عام ٹیکس کے ذریعے سے بالواسطہ مدد بھی مشنریوں کو ملتی تھی اور براہِ راست اعانت بھی کی جاتی تھی۔

(۹) قابل اور اہلِ مصنفین سے اسلام کی تعلیم اور اُس کی تاریخ اور نظریۂ پاکستان سے متعلق کافی مقدار میں لٹریچر تیار کرا کے حکومت کی طرف سے اُسے پاکستان کی جملہ قومی اور علاقائی

زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے۔ اسے یا تو بلا قیمت تقسیم کیا جاتا ہے یا ارزاں فروخت کیا جاتا ہے۔

(۱۰) تمام اجنبی مشنری تعلیم گاہیں اور ہسپتال فوراً حکومت کی تحویل میں لے لیے جائیں اور انہیں یا تو پاکستانی سٹاف کے ذریعے سے چلایا جائے یا پھر ان کے لیے اگر ضرورت ہو تو غیر ملکی ماہرین کی خدمات خود حکومت عارضی طور پر حاصل کرے۔

(۱۱) دیہاتی علاقوں میں آرٹ اور ثقافت کے نام پر جو بے حیائی اور بد اخلاقی کا سیلاب آرہا ہے، اور جن فواحش کو رواج عام دیا جا رہا ہے، ان کی طرف اوّلین توجہ کی جائے۔ سرکاری حکام کو ہدایت دی جائے کہ وہ ان نام نہاد کلچرل تقاریب اور ورائٹی شوز کی صدارت اور سرپرستی نہ کریں، جنہیں آج کل اباحیت پسند عناصر کثرت سے پھیلا رہے ہیں۔

(۱۲) اس قسم کے تمام مُوقیانہ لٹریچر، غیر اخلاقی فلموں اور دیگر مخرّبِ اخلاق مشاغل سے قوم کے نوجوانوں کو بچایا جائے جن کی ملک کے ہر بڑے شہر میں بہتات ہے اور جن کی وجہ سے مغربی ممالک میں جرائم پیشہ نوعمروں کی کثیر تعداد پیدا ہو چکی ہے۔

(۱۳) عیسائی مشنریوں کو اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف علانیہ بدزبانی سے قطعاً روک دیا جائے۔ انہیں نئے نئے مراکز کھولنے کی اور اکثریت کے جذبات کو مجروح کرنے والی حرکات کی ہرگز اجازت نہ دی جائے۔

(۱۴) پاکستان میں سارے متداول عیسائی لٹریچر کا گہرا جائزہ لیا جائے اور اس میں جتنا مواد بھی اکثریت کے احساسات کو ٹھیس لگاتا ہے یا کسی دوسرے لحاظ سے منافی تہذیب و اخلاق ہے، اسے فوراً خلافِ قانون قرار دیا جائے، اور آئندہ بھی جتنا عیسائی لٹریچر شائع ہو اس پر بھی اسی نقطۂ نظر سے کڑی نگاہ رکھی جائے۔

(۱۵) حکومت ملک میں مشنری سرگرمیوں کی پوری پوری نگرانی کرے اور جہاں ضروری سمجھے اُن پر قدغن لگائے۔ مختلف مشنری تنظیمیں جتنے کارکن، فنڈ اور ساز و سامان باہر سے درآمد کریں اُن کا باقاعدہ ریکارڈ وقتاً فوقتاً شائع کیا جانا ہے ـــــ اگر ملک کی نوخیز مادی صنعت و حرفت کو باہر کی ترقی یافتہ اور منظم صنعت کاری سے بچانے کے لیے حفاظتی حد بندیاں عائد کی جا سکتی ہیں تو جو قوم کہ سیاسی زبردستی اور تہذیبی غلامی کے بعد حال ہی میں آزاد ہوئی ہے، اُس کی روحانی اور ایمانی طاقت اس امر کی زیادہ محتاج ہے کہ اس کی بھی محافظت کی جائے۔

اسلامی طلاق

— اس کے فائدے اور طریقہ —

از شیخ ابو زہرہ استاذ قانون اسلامی قاہرہ یونیورسٹی مصر

(محترم مقالہ نگار شیخ ابو زہرہ، مصر کے نہایت ممتاز اور جری عالم ہیں۔ قاہرہ یونیورسٹی مصر میں اسلامی قانون کے استاذ ہیں۔ موصوف اسلامی قانون کا نہایت گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی متعدد تصانیف اہل علم و دانش حلقے سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ بالخصوص ائمۂ اسلام پر اُن کا عظیم الشان مجموعہ اس دور کا بے نظیر تحفہ ہے۔ شیخ موصوف نے اس مجموعہ میں جو امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ، امام ابن حزم، امام زید، امام جعفر صادق (اور امام شاہ ولی اللہ زیر طباعت ہے) پر مشتمل ہے نہ صرف ائمۂ اسلام کی شخصیت اور ان کے فقہی نظریات کو بیان کیا ہے بلکہ اسلامی قانون کے ان تمام مکاتب فکر کی پوری تاریخ اور اس کے ارتقائی مراحل کا جائزہ لیا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی قانون ایک جامد قانون نہیں ہے بلکہ ایک زندۂ جاوید اور بشری ضروریات کو ہر دور میں پورا کرنے والا پاکیزہ قانون ہے۔ موصوف لاہور کے بین الاقوامی اسلامی مذاکرے میں بھی شریک ہوئے تھے۔ مصر میں پچھلے دنوں شام و مصر کے قوانین کو یکساں کرنے کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اُس کے ایک ممبر آپ بھی تھے۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی ہے اُس کی جملہ تفصیلات تو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئیں۔ البتہ طلاق و نکاح اور بیت الطاعۃ کے بارے میں اس رپورٹ کے کچھ اجزاء اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ زیر نظر مقالہ جو صرف طلاق کی بحث پر مشتمل ہے

ہم نے کویت کے ماہوار رسالہ "العربی" سے لیا ہے۔ موصوف نے اس مقالہ میں اسلامی طلاق کے تمام پہلوؤں کو مخالفین کے اعتراضات کی روشنی میں واضح کیا ہے اور پوری جرأت کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ اسلام کے عائلی قانون میں تبدیلی کا مطالبہ کرنے والا عنصر دراصل یہ آرزو رکھتا ہے کہ خاندان کا اسلامی ڈھانچہ ختم کر کے وہاں غیر اسلامی ڈھانچہ نصب کیا جائے"۔ ـــــ خ - ح]

اسلام میں طلاق کا تصور لفظ طلاق بذات خود ایک نہایت ناگوار اور مبغوض لفظ ہے جسے حساس اور باشعور انسان کے ذہن میں آتے ہی یہ لفظ جسم پر ایک تھرتھراہٹ طاری کر دیتا ہے اور نفرت و کراہت کے جذبات سے لبریز کر دیتا ہے۔ شریعت اسلامی بھی اس لفظ کو کراہت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "ما احل اللہ شیئا ابغضہ کالطلاق" (اللہ تعالیٰ نے طلاق کی طرح کسی اور ناپسندیدہ چیز کو حلال نہیں ٹھہرایا) طلاق کے بارے میں شریعت کا یہ نقطۂ نظر اس لیے ہے کہ یہ اُس ربط و تعلق پر تیشہ چلانے والی ہے جو سنت اللہ کے مطابق قائم کیا گیا ہے۔ اور فقہاء کی زبان میں یہ نعمتِ زوجیت کو زائل کرنے والی ہے۔

طلاق کا اختیار کسے ہونا چاہیے ازدواجی رشتہ جب نعمت کے بجائے نفرت و بغض کی صورت اختیار کرے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے طلاق کا راستہ اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار کس کو ہونا چاہیے ...

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جب میاں بیوی دونوں قطع تعلق پر متفق ہو جائیں تو ان کا یہ اتفاق اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ازدواجی زندگی کا چشمۂ صافی انتہائی مکدر ہو چکا ہے اور اب ایک مصلح زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ زوجین کو مزید غور و فکر کی دعوت دے، اس اندیشہ کی بنا پر کہ شاید دونوں فریقوں میں سے کوئی طیش و غضب میں آکر یہ اقدام

کررہا ہو۔ لیکن اگر عقدِ نکاح کو کھول دینے پر دونوں کا اتفاق نہ ہو، بلکہ یک طرفہ خواہش پائی جاتی ہو، تو اب یہ امر قابلِ بحث ہے کہ پھر طلاق کا اختیار کسے ہونا چاہیے، مرد کو یا عورت کو یا عدالت کو؟

طلاق کا اختیار عدالت کو دینے والوں کے دلائل اور ان کا جواب

بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ جب طلاق کے معاملے میں دونوں فریق (میاں اور بیوی) متفقہ طور پر خواہشمند نہ ہوں تو مثالی طریقہ یہ ہے کہ طلاق کا معاملہ حاکمِ عدالت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اور میاں اور بیوی میں سے کسی کو انفرادی اختیار نہ ہونا چاہیے۔ اس گروہ کے دلائل یہ ہیں کہ اولاً عدالت ایک غیر جانبدار ادارہ ہے، ثانیاً جس معاہدے کی رُو سے معاہدہ کے دونوں فریقوں پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہوں اُس معاہدہ کو یک طرفہ خواہش باطل نہیں کرسکتی، ثالثاً اگر طلاق کا اختیار زوجین میں سے صرف ایک فرد کے اختیار میں دے دیا جائے تو غیظ و غضب کا کوئی بھی دورہ رشتۂ ازدواج پر تیشہ چلا سکتا ہے اور اگر بعد میں ندامت کا احساس ہو بھی جائے تو یہ احساس بعد از وقت ہوگا۔

یہ رائے کسی حد تک قابلِ غور تو ہے لیکن اسے اس وقت تک صائب نہیں کہا جاسکتا جب تک انسان کے باطنی اسرار اور قلبی واردات کو کسی ظاہری دلیل سے ثابت کرنے کا انتظام نہ کرلیا جائے۔ ظاہری دلیل کی شرط اس بنا پر لگائی گئی ہے کہ عدالت اپنا فیصلہ صرف ان بنیادوں پر صادر کرسکتی ہے جو اُسے واضح اور محسوس شہادتوں کے ذریعہ فراہم ہوئی ہوں، نیز عدالت کا کام ہمیشہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ حق کیا ہے اور ظلم کیا ہے تاکہ وہ حق کا استقرار اور ظلم کا انسداد کرسکے لیکن ازدواجی فساد کا قضیہ ظالم اور مظلوم کا سا قضیہ نہیں ہے (کہ ظالم کو ظلم سے روکا جائے اور مظلوم کو اس کا حق دلوایا جائے)، بلکہ یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا اب ازدواجی رابطہ میں بقا اور دوام کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے۔ مثلاً اگر خاوند عدالت کے پاس طلاق کا مطالبہ لے کر جاتا ہے اور مطالبۂ طلاق کی بنیاد یہ ہے کہ وہ بیوی کے رویّہ سے بیزار

ہو چکا ہے اور اصلاح کی تمام کوششیں صدا بصحرا ثابت ہوئی ہیں۔ تو کیا حاکم عدالت طلاق صادر کریگا یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ حاکم عدالت مزید اصلاح و اتحاد پر زور دے گا لیکن اگر وہ بھی اپنی سعی میں ناکام ہو گیا تو صرف ایک ہی راستہ باقی رہ جاتے گا اور وہ ہے طلاق کا راستہ۔ اب غور کیجیے کہ خواہ خاوند (مایوس ہوکر) خود ہی ابتداءً بیوی کو طلاق دے یا حاکم عدالت (ناکام ہوکر) تفریق کرے، نتیجہ کے لحاظ سے دونوں صورتوں میں فرق کیا واقع ہوا؟ اس کے سوا اور کیا فرق نظر آتا ہے کہ عدالت نے خاوند کو عجلت کے بجاتے تحمل و تدبر پر اکسایا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ طلاق کے معاملہ میں عجلت اور جلد بازی کے بجاتے صبر و تحمل اور انتظار کا انتظام تو خود شریعت اسلامی کے نظامِ طلاق میں بصورت احسن و اتم موجود ہے۔

طلاق کا حق مرد کو کیوں حاصل ہے شریعت نے طلاق (یعنی حقوقِ زوجیت سے دستبردار ہو جانے) کا اختیار اصالتًا مرد ہی کو دیا ہے کیونکہ مرد کئی مالی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مثلاً ازدواجی تعلق کی ابتدا میں تمام مالی بار کو اٹھانے والا مرد ہی ہے اور طلاق دینے کی صورت میں بھی مزید مالی بوجھ اُس کے کندھوں پر آکر پڑے گا، مثلاً بچوں کا مخصوص نفقہ اُسے ادا کرنا ہوگا، رضاعت اور حضانت (پرورش) کی اجرت اُس کے ذمہ ہوگی یہ اُن مصارف کے علاوہ ہوں گے جو اُسے آئندہ کسی نئے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے وقت پیش آئیں گے۔ یہ تمام ذمہ داریاں مرد کو طلاق کا اقدام کرتے وقت بار بار سوچنے اور بار بار اپنے دل سے مشورہ کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں اور اغلب حال میں مرد طلاق کا قطعی فیصلہ اُسی وقت کرتا ہے جب وہ اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتا۔

عورت کا حق خُلع یہاں یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ مرد اگر عورت سے بیزار ہو جائے تو شریعت مرد کا لحاظ تو کرتی ہے اور اُسے مخلصی کے لیے راستہ دکھا دیتی ہے لیکن عورت اگر مرد سے بیزار ہو جائے تو شریعت نے عورت کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ عورت بعض اوقات اپنے خاوند سے سخت متنفر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ مرد کے ساتھ وابستہ رہنے کے لیے اپنے

دل میں ادنیٰ سے ادنیٰ کشش بھی نہیں پاتی اور ازدواجی زندگی اُس کے لیے آفت بن جاتی ہے لیکن چونکہ اُس کی نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اس لیے وہ مرد کا بستہ فتراک بن کر ٹکی رہتی ہے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ شریعت نے عورت کا بھی پورا پورا لحاظ کیا ہے اور عورت کو خلع کا حق دے کر اس خرابی کا علاج کر دیا ہے۔ خلع کی صورت یہ ہوتی ہے کہ عورت اپنا مہر جو مرد نے اُسے ازدواجی تعلق کا آغاز کرتے ہوتے دیا تھا، مرد کو پیش کرکے علیحدگی کا مطالبہ کرے۔ عورت کا یہ حق قرآن کی آیتِ ذیل سے ثابت ہے: ولا یحل لکم ان تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئاً الا ان یخافا الّا یقیما حدود اللہ، فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہ، تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا، تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو۔ اس میں سے کچھ بھی واپس لو۔ الّا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے، تو ایسی صورت میں جبکہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقد نکاح سے آزادی حاصل کرے۔

خُلع کے باب میں امام مالک کا مسلک | امام مالک رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ بعض اوقات عورت خاوند سے کراہت و نفرت کرتی ہے اور اُس سے گلو خلاصی کرانا چاہتی ہے مگر خاوند اصل مہر کے معاوضہ میں اُسے طلاق دینے کے لیے راضی نہیں ہوتا، اور اُسے تنگ کرنے لگتا ہے تاکہ طلاق کا معاوضہ اصل مہر سے زیادہ وصول کرے، یا محض اُسے ستانے کے لیے سخت گیری شروع کر دیتا ہے لہٰذا امام مالکؒ قاضی شرع کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر عورت طلاق کی خواہشمند ہو تو مرد نہ بھی چاہتا ہو تو وہ مرد کی خواہش کے علی الرغم تحکیم حکمین کے بعد خلع نافذ کر دے اور اگر نفرت و افتراق کا اظہار عورت کی جانب سے ہو مگر مرد کی طرف سے کسی ظلم و زیادتی کا اظہار نہ ہوا ہو تو ایسی صورت میں قاضی تفریق صادر کر دے اور عورت پر لازم کر دے کہ وہ یا تو پورا مہر یا اُس کا کچھ حصہ مرد کو واپس لوٹائے۔

جون ۱۹۵۶ء میں مصر میں شخصی قوانین کا جو نظام تجویز کیا گیا تھا اُس میں امام مالک رحمہ اللہ کے مذکورۂ بالا مسلک کو معمول بہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ آج کل شام و مصر کے قوانین کو یکساں کرنے کے لیے جو خاکہ مرتب کیا گیا ہے، اُس میں بھی اس تجویز کو شامل کر لیا گیا ہے۔

قضیۂ طلاق کو عدالتی تحقیقات کا ہدف نہ بنانے کے وجوہ طلاق خواہ شوہر دے یا بیوی کے مطالبہ پر عدالت اُس سے دلوائے، یہ فعل اشد ضرورت کے بغیر مباح نہیں ہے۔ لیکن یہ "اشد ضرورت" جو طلاق کو بالآخر مُباح ٹھہراتی ہے، کوئی محسوس اور ٹھوس چیز نہیں ہے جس کا عدالت کے سامنے ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہو۔ بلکہ یہ ضرورت بسا اوقات ایک "باطنی امر" ہو سکتی ہے جیسے دلی نفرت و بیزاری۔ بعض اوقات بلاشبہ وجوہِ بیزاری قابلِ ثبوت و شہادت ہو سکتے ہیں مگر زوجین کی مصلحت اور خاص طور پر عورت کی مصلحت اُن کے اظہار وا علان کی اجازت نہیں دیتی اور بر اغلب حال میں تو سوسائٹی کے مصالح کا تقاضا بھی یہ ہوتا ہے کہ تفریقِ زوجین کے اسباب کا بھانڈا چوراہے میں نہ پھوڑا جائے۔

چنانچہ بعض مصری عدالتوں نے یہ طے کر کے سخت غلطی کی ہے کہ یا تو قاضی کے نزدیک شوہر کی ضرورتِ طلاق کے وجوہ ثابت ہو جائیں ورنہ عدالت مرد کے خلاف طلاق کا معاوضہ (جو مہر کے علاوہ ہوگا) ادا کرنے کا فیصلہ صادر کر دے گی۔ اس غلطی کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ طلاق کی بنا ایسے اسباب بھی ہو سکتے ہیں جنہیں شہادتوں کے ذریعہ سے ثابت نہ کیا جا سکتا ہو یا ثبوت فراہم ہو سکتا ہو مگر قاضی کے سامنے اُن کا افشا درست اور گوارا نہ ہو۔ دراصل خانگی معاملات بڑے نازک اور دقیق ہوتے ہیں۔ شوہر اور بیوی کے باہمی حالات کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ نہ گواہوں کے علم میں آ سکتے ہیں۔ کمرۂ عدالت میں انہیں زیرِ بحث لانا نہ صرف رازہائے درونِ پردہ کا غیر مناسب افشا ہے بلکہ خاندان کے تقدس پر اس سے حرف آتا ہے۔ اسی لیے شریعت نے خانگی مسائل کو زیادہ تر ہر شخص کے دین و ایمان پر چھوڑا ہے۔ اور

اللہ تعالیٰ کا محاسبہ یاد دلایا ہے جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی حقیقت کی روشنی میں فقہائے اسلام نے طلاق کے مسئلے کو نری قانونیت کے بل پر نہیں بلکہ دین و تقویٰ کی اخلاقی بنیادوں پر حل کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

غصہ کی حالت میں دی جانے والی طلاق یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ مرد بعض اوقات بے قابو ہو کر طلاق دے ڈالتا ہے اور طیش و غضب کے ایک ہی دورے سے پورے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یا وہ اعصابی اضطراب سے مغلوب ہو کر یہ اقدام کر دیتا ہے مگر جب وہ سکون کی حالت میں آتا ہے اور اُس کے ہوش ٹھکانے ہوتے ہیں تو کفِ افسوس ملنے لگتا ہے۔ کیونکہ اُس سے جو حرکت سرزد ہو چکی ہے اُس کا کوئی پیشگی منصوبہ یا عزم اُس نے نہیں کیا تھا۔ اب اگر قانونِ فوجداری کی رُو سے قاتل کو سزائے موت دینے کے لیے یہ شرط ہے کہ اقدامِ قتل سے پہلے قتل کا ارادہ و منصوبہ پایا جانا ضروری ہے تو ایک خاندان کو بھی ایسی صورت میں ہلاک و تباہ کرنا درست نہیں ہو گا جب کہ ثابت ہو جائے کہ اس کی تباہی و ہلاکت کا پہلے سے کوئی منصوبہ و ارادہ نہیں تھا اور نہ ایسے کسی ارادہ و منصوبہ کو نافذ کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

طلاق کا مسنون طریقہ اس پُر زور استدلال کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے طلاق دینے کا جو طریقہ مقرر کیا ہے اُس میں ان خدشات کا مکمل تدارک کیا گیا ہے۔ مثلاً اسلام نے پہلی ہدایت یہ دی کہ طلاق مسنون طریقہ کے مطابق دینی چاہیے۔ مسنون طریقہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ہی رجعی طلاق دی جائے۔ طلاقِ رجعی میں یہ موقع باقی رہتا ہے کہ مرد اگر چاہے تو دورانِ عدت نئے نکاح اور نئے مہر کے بغیر ہی بیوی کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ زمانۂ حیض میں طلاق نہ دی جائے۔ کیونکہ عورت ان ایام میں اعصابی اضطراب میں مبتلا ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ مرد و عورت کی باہمی چپقلش اسی اعصابی عارضہ کا نتیجہ ہو۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس واقعے کو عرض کیا، آپ سُن کر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دے دو کہ رجوع کرے کیونکہ یہ طلاق طریقۂ سنت کے خلاف تھی۔ طلاق کی قیود میں سے یہ بھی ہے کہ طلاق اُس طُہر میں نہ دی جائے جس میں مرد عورت سے خلوت کر چکا ہو۔ یہ ایک سراسر غیر معقول بات ہے کہ جب مرد عورت سے اس حد تک بیزار ہو چکا ہو کہ اُس کے دل میں خوش اسلوبی سے بیوی کے ساتھ نباہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی ہو تو پہلے اُس سے خلوت کرے اور پھر طلاق دے دے۔

یہ ہے طلاق کا مسنون طریقہ۔ جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ قیود و شرائط کے مطابق طلاق دیتا ہے تو یہ اس امر کی واضح علامت ہے کہ اس شخص کے دل میں اب بیوی سے حسنِ معاشرت کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اس کی بیزاری اعصابی اضطراب کے تحت نہیں ہے بلکہ پورے تدبّر و تحمّل پر مبنی ہے۔ بایں ہمہ شارعِ کریمؐ نے اس کے لیے عدت کے دوران رجوع کر لینے کا آخری موقع بھی باقی رکھا ہے۔ عدّت کا زمانہ اکثر فقہاء کے نزدیک تین حیض ہیں جو بالعموم تین ماہ کو محیط ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ایک سال یا ایک سال سے زیادہ عرصہ تک ممتد ہو جاتے ہیں۔ اگر عدت کا زمانہ گزر جائے اور مرد مراجعت کا موقع ملنے کے باوجود رجوع نہ کرے تو یہ کمالِ نفرت کی علامت ہے۔ شارع کریمؐ نے اس کے باوجود فریقین کو اجازت دی ہے کہ اگر تیسری طلاق نہ دی گئی ہو، تو وہ دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اور اپنے ازدواجی ربط کو بحال کر سکتے ہیں۔

بہر حال شریعت نے مرد کو تین طلاقوں کا حق دیا ہے۔ اگر پہلی اور دوسری طلاق کے بعد زوجین نے رجوع کر لیا اور پھر کسی وقت مرد نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب مرد کے لیے رجوع کا اور دوبارہ نکاح کرنے کا کوئی حق نہ رہا۔ اب اگر وہ سابقہ بیوی کو عقدِ نکاح میں لا سکتا ہے تو عورت کی تحلیل کے بعد لا سکتا ہے۔ تحلیل کی مشروع صورت یہ ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے سے نکاح کرے، اور وہ شخص اُس سے ازدواجی تعلق قائم کرے اور پھر دونوں کا رشتۂ زوجیت موت

کی وجہ سے یا ذاتی اسباب کے تحت طلاق واقع ہو جانے کی وجہ سے منقطع ہو تب وہ عورت اپنے سابق خاوند کے لیے حلال ہو سکتی ہے۔ بہر حال یہ ہے علیٰ منہاج السنۃ طلاق دینے کی صورت، جس میں ایک وقت میں اور ایک طہر کے اندر ایک طلاق دی جاتی ہے۔

طلاق بدعی کا حکم اب سوال یہ ہے کہ طریقۂ سنت کے برخلاف جو طلاق دی جائے گی وہ واقع ہو گی یا نہیں۔ امامیہ (یعنی اثنا عشریہ)، اکثر زیدیہ اور امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک وہی طلاق واقع ہو گی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ طریقہ اور حدود و قیود کے ساتھ دی جائے گی۔ ائمۂ اربعہ کے نزدیک طلاق بدعی (منہاج السنت کے خلاف دی ہوئی طلاق) بھی واقع ہو جاتی ہے لیکن ایسی طلاق دینے والا اللہ کے نزدیک سخت مجرم اور گنہگار ہے (ومن یکسب اثما فانما یکسبہ علی نفسہ)

قانونِ طلاق کی سابقہ ترمیمات مصر ۱۹۲۹ء تک طلاق کے مسئلہ میں مذہب حنفی کا پیرو رہا ہے لیکن ۱۹۲۹ء میں اس میں تبدیلی واقع ہوئی اور شخصی قوانین کی دفعہ ۲۵ کی رُو سے اس مسئلہ میں ائمۂ اربعہ کے مذاہب اور امام ابن تیمیہؒ کے مختار اقوال میں سے اُن اقوال و آراء کو اختیار کر لیا گیا جن سے وقوع طلاق کی تیزی کافی حد تک نرم ہو گئی۔ علاوہ ازیں یہ بھی طے کیا گیا کہ نوعیت ذیل کی طلاقوں کے علاوہ ہر طلاق رجعی سمجھی جائے گی:

(۱) وہ طلاق جو خلوتِ صحیحہ سے قبل دی گئی ہو (۲) وہ طلاق جو عورت مالی معاوضہ دے کر حاصل کرے (۳) تیسری تکمیلی طلاق جو پہلی اور دوسری طلاقوں کے بعد تیسرا حیض گزرنے پر دی جائے۔ (۴) وہ طلاق جسے قانون طلاقِ بائن قرار دے۔ قانون میں یہ توضیح بھی کر دی گئی کہ جبر و اکراہ کے تحت یا بے ہوشی کی حالت میں جو طلاق دی جائے گی وہ واقع نہیں ہو گی۔ اسی طرح طلاق معلق بھی واقع نہیں ہو گی۔ طلاق معلق سے مراد طلاق کی وہ صورت ہے جس میں اصلاً طلاق دینے کا قصد نہ کیا گیا ہو بلکہ عورت کو کسی کام سے باز رکھنے یا کسی کام پر آمادہ کرنے کی خاطر یا اپنی بات کو پختہ اور وزن دار بنانے کے ارادے سے طلاق کا لفظ بولا گیا ہو۔ یہ احکام ابن تیمیہ کے مختار

اقوال و فتاویٰ سے ماخوذ ہیں اور ابن تیمیہ کا ماخذ فقہائے امامیہ ہیں۔

طلاق رجعی اور طلاق بائن کا فرق یہاں طلاق رجعی اور طلاق بائن کا فرق واضح کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ طلاق رجعی میں ازدواجی رشتہ فی الفور منقطع نہیں ہو جاتا بلکہ عدت ختم ہونے کے بعد منقطع ہوتا ہے۔ چنانچہ عدت کے دوران شوہر اور بیوی میں سے کوئی ایک مر جائے تو وہ ایک دوسرے کے ترکہ میں سے حصّہ پائیں گے۔ اسی طرح طلاق رجعی میں مرد عقدِ جدید اور مہر جدید کے بغیر ہی، صرف "میں نے رجوع کر لیا" کے الفاظ کہہ دینے سے اپنے رشتۂ زوجیت کو بحال کر سکتا ہے لیکن بہرحال طلاق رجعی تین طلاقوں میں سے ایک طلاق محسوب ہو گی۔ اس کے برعکس طلاق بائن احکام عدت کے ماسوا رشتۂ زوجیت کے ہر اثر کو فی الفور ختم کر دیتی ہے۔ اگر طلاقِ بائن کے بعد فریقین میں سے کوئی ایک اثنائے عدت یا بعد عدت مر جائے تو وہ ایک دوسرے کے ترکہ کے وارث نہیں ہوں گے۔

طلاق بائن کی قسمیں طلاق بائن کی بھی دو قسمیں ہیں: بائن اصغر اور بائن اکبر۔ بائن اصغر کے لیے بائن غیر مغلظ اور بائن اکبر کے لیے بائن مغلظ کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔ بائن اکبر وہ طلاق ہوتی ہے جو پہلی اور دوسری مسنون طلاقوں کے بعد تیسری تکمیلی طلاق دی جائے۔ بائن اکبر میں عورت اپنے سابقہ شوہر کے لیے صرف اسی وقت حلال ہو سکتی ہے جب مشروع طریقہ کے مطابق اُس کی تحلیل ہو جائے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ بائن اصغر وہ طلاق ہوتی ہے جو تیسری تکمیلی طلاق نہ ہو۔ اسی طرح خلوتِ صحیحہ سے قبل دی جانے والی طلاق یا وہ طلاق جو عورت مال کے عوض مرد سے حاصل کرتی ہے، بھی بائن اصغر ہو گی جس میں عورت اپنے سابق شوہر کے لیے نئے مہر اور نئے عقد کے ساتھ حلال ہو جائے گی۔

اسلام کے عائلی قوانین پر مغربی حملوں کا آغاز اسلامی ممالک میں جملہ عائلی احکام اسلامی طریقہ پر جاری و ساری تھے، جو کتاب اللہ، سنتِ رسول، آثارِ صحابہ اور اقوالِ فقہاء و مجتہدین سے ماخوذ تھا۔ مسلمان ائمہ و فقہاء نے عائلی احکام کی جو حدود و قیود شریعتِ اسلامی کے مطابق مقرر کی

ہوئی تھیں ملتِ اسلامیہ ان کی پوری پابندی کر رہی تھی اور کبھی ان سے بیزار اور دل گرفتہ نہیں ہوئی تھی۔ مگر ماضی قریب میں یکایک مغربی مصنفین کی طرف سے اسلام کے عائلی قوانین پر تنقید و استہزاء کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اور انہوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ مسلمان عورت انتہائی مظلوم ہے اور اس کے تمام حقوق سلب کر لیے گئے ہیں۔ حالانکہ شریعت اسلامی نے عورت کو اپنی ذات اور اپنے مال و متاع پر مکمل اختیار دیا ہے اور اس کے مقابلے میں مغربی عورت کو آج تک یہ اختیارات نصیب نہیں ہو سکے۔ لیکن اہلِ مغرب کی یہ عیاری تھی کہ انہوں نے ان پہلوؤں کو تو نظر انداز کر دیا اور طلاق کے مسئلہ کو ہدفِ طعن بنا لیا اور مختلف پیرایوں سے اس شرعی مسئلہ پر اپنے زہریلے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اور مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی ان کا ہمنوا بن گیا۔

مصری متجددین موجودہ صدی کے اوائل میں مصر میں مرحوم قاسم امین اٹھے۔ انہوں نے اپنی دونوں کتابوں "عورت کی آزادی" اور "جدید عورت" میں طلاقِ شرعی پر اہلِ مغرب کی تقلید میں سخت حملے کیے اور طلاق کو محدود اور مقید کر دینے کا مطالبہ اٹھایا۔ بلکہ اس سلسلہ میں نئے احکام و مسائل بھی وضع کر لیے اور دعویٰ یہ کیا کہ یہ احکام فقہاء کے اقوال سے ماخوذ ہیں یا ان کی تخریج فقہاء کے اقوال پر کی گئی ہے۔ اس وقت ہمیں اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ مرحوم کی تخریجات و آراء کی حقیقت کیا ہے لیکن یہ بات بالکل عیاں ہے کہ آج کل عرب ممالک میں "تجدید و اصلاح" کے جتنے داعی پائے جاتے ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے کوئی ایسی انوکھی یا طبعزاد تجویز پیش کی ہو، جو قاسم امین نہ کر چکا ہو۔ بلکہ یہ سب حضرات اُسی کی مکھی پر مکھی مار رہے ہیں۔

کیا طلاق کا رجحان بڑھ رہا ہے اس وقت اصل سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ چونکہ اب طلاق کا استعمال غلط ہو رہا ہے تو کیا گھروں اور خاندانوں کی بربادی کی تمام تر ذمہ داری طلاق کے اوپر ڈالی جاتے؟ — یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اس بربادی کے واقعات مصری شہروں

ملیں تو بکثرت سامنے آرہے ہیں مگر دیہاتی آبادی اس مصیبت سے محفوظ ہے۔

اس مسئلہ پر ہم اعداد و شمار کی زبان میں روشنی ڈالیں گے۔ کیونکہ دَور حاضر کی ذہنیت کے لیے اس سے بڑھ کر بلیغ کوئی انداز نہیں ہے۔

اب سنیے، سنہ ۱۹۵۰ء میں مصر میں طلاقوں اور شادیوں کا تناسب تقریباً ۳۰ فیصد تھا۔ اس کے بعد یہ تناسب گرنا شروع ہوا حتیٰ کہ ۲۸ فیصد تک پہنچ گیا اور بالآخر سنہ ۱۹۵۵ء میں ۲۳ ½ پر تک آگیا۔ کیونکہ اس سال شادیوں کی تعداد ۲ لاکھ ۷۰ ہزار تھی جب کہ طلاقوں کی تعداد ۶۳ ہزار تھی۔ یہ تخمینہ ہم نے شماریات کی اس کمیٹی سے لیا ہے جو وزارت معاشرتی بہبود اور وزارتِ تعلیم نے مل کر شماریاتی مہم کے لیے تشکیل دی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ نکاح و طلاق کا تناسب (شرعی قانون کی عملداری میں ہی) از خود نیچے اتر رہا ہے اور اس کے منجملہ اسباب میں سے عوام کی بیداری اور شعور کی پختگی، شادی کے غیر معمولی مصارف اور معیارِ زندگی کا ارتفاع ہے۔

طلاق اور اس کے مبینہ نقصانات کا حقیقت پسندانہ جائزہ معاشرتی علوم کے ماہرین کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہر طلاق زوجین کے درمیان قطع تعلق کا موجب نہیں ہوتی اور نہ ہر طلاق خاندانی بربادی کا سبب ہوتی ہے اور نہ ہر طلاق ضیاعِ اولاد کا پیغام لے کر آتی ہے۔ یہ بات ہم کسی جذباتی رَو میں نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی دلائل کے ساتھ توضیح کیے دیتے ہیں۔

ہمارا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر طلاق زوجین کے قطع تعلق پر منتج نہیں ہوتی۔ چنانچہ مباحث گذشتہ سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ طلاق کی دو قسمیں ہیں: طلاقِ رجعی اور طلاق بائن اور بائن کی بھی دو قسمیں ہیں بائن اکبر اور بائن اصغر۔ طلاق رجعی کے بارے میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ محض زبان سے نکال دینے اور قاضی کے پاس اس کی توثیق کر دینے سے رشتۂ مناکحت کو نہیں کاٹ دیتی۔ اس میں مرد رجوع کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسے موجبِ انقطاع کے بجائے

انقطاع کا الٹی میٹم کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا طلاقوں کی جو تعداد آپ گنوائیں اُس میں سے رجعی طلاقوں کو حذف کر دیں۔ اس سے ہم بآسانی معلوم کر سکیں گے کہ کس طلاق نے فی الواقع تفریق پیدا کی اور کونسی الارم بجانے پر ختم ہو گئی۔ اسی طرح طلاق بائن (یعنی بائن اصغر) میں دوبارہ نکاح کیا جا سکتا ہے اور کٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا جا سکتا ہے۔ لہٰذا قطعی اور دائمی انقطاع کی صورت یہاں بھی معدوم ہے۔ بنابریں لازم ہے کہ ان شادیوں کو بھی کم کر دیا جائے جو طلاق کے بعد دوبارہ نکاح و مہر کے ساتھ منعقد ہوئیں۔

ہمارا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ہر تفریق لازماً خاندانی بربادی کو جنم نہیں دیتی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ خلوتِ صحیحہ سے قبل جو طلاق دی جاتی ہے اُس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ طلاق سے بڑھ کر دراصل ایک ایسے خطرے کا تدارک ہوتا ہے جو غیر صحت مندانہ انتخاب و ازدواج کی بنیاد پر نئے خاندان کی تشکیل کی صورت میں ہو سکتا تھا۔ پس اس طلاق نے دراصل خاندان کو مسمار نہیں کیا کیونکہ خاندان تو ابھی وجود پذیر نہیں ہوا، بلکہ اس نے خاندان کی چہار دیواری کو غیر مستحکم اور نادرست بنیادوں پر استوار ہونے سے بچا لیا۔

ہمارا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ اغلب حال میں طلاق ضیاعِ اولاد کا پیغام لے کر نہیں آتی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ طلاق کے راستہ کا سب سے بڑا پتھر خود اولاد ہے۔ چنانچہ ۴۱ - ۴۰ - ۱۹۳۹ء کے طلاق کے اعداد و شمار سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ان سالوں میں جو طلاقیں ہوتی ہیں اُن میں سے ۷۵ فیصد سے زیادہ وہ طلاقیں ہیں، جو اولاد سے پہلے واقع ہوتی ہیں، ۱۷ فیصد طلاق صرف ایک بچے کے پیدا ہونے کے بعد ہوئیں۔ اسی طرح جوں جوں بچوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے طلاق کا تناسب گھٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ جب پانچ بچوں تک معاملہ پہنچتا ہے تو طلاق کا تناسب ۱٪ رہ جاتا ہے۔ یہ اعداد و شمار کی زبان اس امر کا واضح ثبوت دے رہی ہے کہ طلاق کا ضیاعِ اولاد سے کوئی تعلق نہیں ہے بچے طلاق کے معاملے میں مرد کے لیے بڑی بھاری زنجیر ہوتے ہیں بلکہ کوئی دوسری زنجیر خواہ کتنی ہی مضبوط ہو بچوں سے بڑھ کر طلاق کا انسداد نہیں کر سکتی۔ یہ فطرت کا قانون ہے، جیسے

(باقی ص ۶۲ پر)

تعارفِ کتب

[خلافتِ معاویہؓ و یزید پر تبصرہ کتاب وصول ہونے کے کچھ مدت بعد ہی لکھ دیا گیا تھا۔ مگر اس کتاب کے کراچی میں ضبط ہونے کی وجہ سے اسے ترجمان القرآن میں شائع نہ کیا جا سکا۔ اب جبکہ اس تصنیف پر سے پابندی ہٹا دی گئی ہے تو اس کے بارے میں چند معروضات پیش کی جاتی ہیں۔ اس کتاب کی مخالفت اور موافقت میں اتنی آراء آچکی ہیں کہ اس پر کوئی تفصیلی بحث محض "تحصیلِ حاصل" ہوگی اسی احساس کے پیشِ نظر ہم نے اپنی گزارشات کے بہت سے حصوں کو حذف کر دیا ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ہمارے پیشِ نظر کتاب کا صرف پہلا ایڈیشن ہے ــ ادارہ]

خلافتِ معاویہؓ و یزید | تالیف۔ جناب محمود احمد عباسی صاحب۔ ناشر: جناب محمود احمد عباسی۔ کاشانۂ محمود ۱/۲۹ پی ایریا۔ لالوکھیت کراچی نمبر ۱۹ قیمت چھ روپے، صفحات ۴۲۷۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری کے ذہن میں ایک عام احساس جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مصنّف نے تحقیق کے معاملے میں اس غیر جانبداری کا ثبوت نہیں دیا جو اس نوعیت کے کاموں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یزید پر لعنت بھیجنا کوئی دینی فریضہ نہیں کہ اگر اس کے خلاف کچھ ثابت ہو جائے تو کسی حساس دل کو ٹھیس لگے گی۔ اگر یزید تاریخی حقائق کی روشنی میں بے گناہ ثابت ہو جائے تو خوشی کی بات ہے۔ مگر اس شخص کو انتہائی متقی اور پرہیزگار اور معصوم ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے نہایت واضح شواہد کو نظر انداز کرنا ایک ایسی جسارت ہے جو کسی صاحبِ علم کے مرتبہ سے بڑی فروتر معلوم ہوتی ہے۔

یوں نظر آتا ہے کہ فاضل مصنّف نے سب سے پہلے اپنے ذہن میں یزید کی نیکی اور پاکبازی کا تصور جما لیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے مختلف کتب کی ورق گردانی شروع کی۔

چنانچہ انہیں اپنے اس تصور کی تائید میں جو کمزور سے کمزور دلیل بھی فراہم ہوئی اُسے بلاتکلف نقل کرتے چلے گئے اور اپنے اس نظریہ کے خلاف اگر مضبوط سے مضبوط چیزیں بھی ملیں تو انہیں "شیعیت نوازی" کہہ کر یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ تحقیق کے اس انداز سے عام طور پر جو نتائج اخذ ہوتے ہیں اُن میں کسی حد تک "سنسنی خیزی" کی شان تو پیدا کی جا سکتی ہے مگر وہ صحیح اور متوازن نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب عباسی صاحب اس اعتدال کو قائم نہیں رکھ سکے جو انہیں فی الواقع قائم رکھنا چاہیے تھا۔ انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جس طریق سے توصیف بیان کی ہے اُس سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذاتِ مقدس مجروح ہوتی ہے اور یزید کی مدافعت میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔ پھر اس بات کو محض ایک "داخلی تاثر" سمجھ کر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ عباسی صاحب نے اس معاملے میں کافی "تگ و دو" کی ہے اور اگر انہیں اپنے اس موقف کی تائید میں علمی تحریفات تک بھی کرنا پڑیں تو ان سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس کی چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

عباسی صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۴۹ پر "البدایہ والنہایہ" سے یزید کی منقبت یوں بیان کی ہے:

"وقد كان يزيد فيه خصال محمودة من الكرم والحلم والفصاحة والشعر والشجاعة وحسن الرأي في الملك وكان ذا جمال حسن المعاشرة۔ (جلد ۸ صفحہ ۲۳۰)	اور یزید کی ذات میں قابلِ ستائش صفات حلم و کرم فصاحت و شعر گوئی اور شجاعت و بہادری کی تھیں۔ نیز معاملاتِ حکومت میں عمدہ رائے رکھتے تھے اور معاشرت کی خوبی و عمدگی بھی ان میں تھی"۔

مصنف نے اس عبارت کو توڑی شدہ مدہ سے نقل کیا ہے لیکن اسی عبارت کا اگلا ٹکڑا چونکہ اُن کے مفید مطلب نہ تھا اس لیے اُسے یکسر نظر انداز کر گئے۔ وہ فقرہ بھی سنیے:

وكان فيه ايضا اقبال الشهوات و ترك بعض الصلوات في بعض الاوقات	اور اسی طرح اس کے اندر شہوات کی طرف میلان موجود تھا، بعض اوقات وہ نمازیں بھی ترک کر دیا

واما انتعانی غالب الاوقات۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۲۳)

کرتا تھا اور اکثر اوقات وہ انہیں بالکل آخری وقت میں ادا کرتا۔

مصنف کے اس حرفِ نظر کو آن کی ذہنی جنبہ داری کے علاوہ اور کس چیز پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۵۵ پر امام غزالیؒ کے حوالہ سے ایک عبارت یوں نقل کی گئی ہے:

"علامہ ابن کثیر نے بھی فقیہ الکیا الھراسیؒ کے استفتاء اور امام غزالیؒ کے فتوے کا تذکرہ کرتے ہوئے یزید پر سبّ و شتم کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ وہ مسلمان تھے اور یہ ثابت نہیں کہ وہ قتلِ حسین سے راضی تھے"۔

منع من شتمه ولعنه لانه مسلم ولم يثبت بانه رضی بقتل حسین . . . . واما الترحم علیه فجائز بل مستحب بل نحن نترحم علیه فی جملة المسلمین والمومنین عموماً فی الصلوات ۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۷۳)

"اور امام غزالیؒ نے (امیر یزید پر سب و شتم کرنے سے)، منع کیا ہے کیونکہ وہ مسلمان تھے اور ثابت نہیں کہ وہ قتلِ حسین سے راضی تھے ... لیکن ان پر (یزید پر) رحمۃ اللہ علیہ کہنا، سو یہ جائز ہے بلکہ مستحب ہے اور ہم ان پر رحمت کی دعا اپنی نمازوں میں تمام مسلمین و مومنین کے شمول سے مانگا کرتے تھے"۔

اب ذرا آپ اسی البدایہ والنہایہ کی پوری عبارت ملاحظہ فرمائیں :-

ومنع من شتمه ولعنه، لانه مسلم ولم یثبت بانه رضی بقتل الحسین ولو ثبت لم یکن ذالک مسوغاً للعنه لان القاتل لا یلعن لاسیما وباب التوبة مفتوح والذی یقبل التوبة عن عبادہ غفور رحیم

(اور امام غزالیؒ نے سب و شتم سے منع کیا ہے کیونکہ یزید مسلمان تھا اور یہ ثابت نہیں کہ وہ قتلِ حسین سے راضی تھا اور اگر بالفرض یہ ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی لعنت جائز نہیں کیونکہ قاتل پر لعنت نہیں کی جاتی خصوصاً جب کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوتا ہے اور وہ غفور و رحیم ذات اپنے بندوں کی توبہ قبول کر لیتی ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ عباسی صاحب نے "اما الترحم علیه فجائز" کا جو یہ ترجمہ کیا ہے کہ ان (یزید) پر رحمۃ اللہ علیہ کہنا جائز ہے، اسی سے اُن کے ذہنی میلان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے مصنف نے جس البدایہ والنہایہ کی عبارتوں کو توڑ موڑ کر یزید کی معصومیت ثابت کرنے کے لیے دلائل فراہم کیے ہیں اسی میں یہ بات بھی درج ہے کہ عبید اللہ بن زیاد نے یزید کے اس مطالبہ پر کہ وہ مکہ کا محاصرہ کرے یہ کہا:-

واللہ لا اجمعهما للفاسق ابداً اقتل ابن بنت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم واغزو البیت الحرام (البدایہ والنہایہ ص۲۱۹ جلد ۸)	خدا کی قسم: میں ایک فاسق کے لیے دو باتیں کبھی جمع نہیں کروں گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کا قتل بھی کروں اور بیت الحرام پر چڑھائی بھی کروں۔

عباسی صاحب یزید کی منقبت میں صحیح البخاری کی یہ حدیث تو نقل فرماتے ہیں کہ:-

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر قسطنطنیہ پر جہاد کرے گی ان کے لیے مغفرت ہے:"

مگر کیا وہ دوسری حدیث اُن کی نظر سے نہیں گزری جسے صاحبِ روح المعانی نے طبرانی کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے:-

اَللّٰھم من ظلم اھل المدینة واخافهم فاخفه وعلیه لعنة اللہ والملائکة والناس اجمعین لا یقبل منه صرف وعدل۔ (روح المعانی از علامہ شہاب الدین السید محمود الآلوسی ص۷۲ جلد ۲۶۔)	اے اللہ جنہوں نے اہلِ مدینہ پر ظلم کیا اور انہیں خوفزدہ کیا تو بھی انہیں خوف زدہ کر، اور اُس پر اللہ اس کے فرشتوں اور پوری نوعِ بشری کی لعنت ہو اُن کی نہ تو توبہ قبول کی جائے گا اور نہ ہی اُن سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔

اور فاضل مصنف سے یہ بات مخفی نہیں کہ اُسی البدایہ والنہایہ میں جو اُن کی کتاب کا

اصل ماخذ ہے۔ ابن کثیر نے خود تسلیم کیا ہے کہ یزید نے مدینہ کو تین دن کے لیے مباح قرار دے دیا تھا:

وقد اخطأ یزید خطأً فاحشاً فی قولہ لمسلم بن عقبہ ان یبیح المدینۃ ثلاثۃ ایام وھذا اخطأ کبیر فاحش مع ما انضم الی ذالک من قتل خلق من الصحابۃ وابنائھم، وقد تقدم انہ قتل الحسین والصحابۃ علی یدی عبید اللہ بن زیاد وقد وقع فی ھذہ الثلاثۃ ایام من المفاسد العظیمۃ فی المدینۃ النبویۃ ما لا یحد ولا یوصف، مما لا یعلم الا اللہ عز وجل۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۲۲)

یزید نے مسلم بن عقبہ کو یہ کہکر کہ وہ مدینہ کو تین دن تک مباح رکھے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور اس کے ساتھ جب یہ بات بھی شامل ہو جاتی ہے کہ اُس نے بہت سے صحابہ کرام اور اُن کی اولادوں کو قتل کیا تو جرم کی نوعیت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یزید نے امام حسین اور ان کے ساتھیوں کو عبید اللہ بن زیاد کے ہاتھوں قتل کروایا تھا۔ مدینہ نبوی میں ان تین دنوں میں ایسے عظیم مفاسد رونما ہوتے رہے جن کی کوئی حد نہیں اور جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا اور جنہیں بس اللہ ہی جانتا ہے۔

مدینہ کو مباح قرار دینے کے بعد لوگوں پر جو ظلم و ستم ڈھاتے گئے، عورتوں کی جس طرح عصمت دری کی گئی اور معصوم بچوں کو جس طرح قتل کیا گیا اُس کی تفصیل البدایہ والنہایہ میں بھی موجود ہے۔ یہ ساری داستان اتنی دلفگار ہے کہ آج پھر اس کے پڑھنے کے بعد جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے معلوم نہیں عباسی صاحب نے اس طرف کیوں توجہ نہیں دی۔

فاضل مصنف اپنے جذبات کا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتے اگر وہ اُن احادیث پر بھی ایک نگاہ ڈال لیتے جو حدیث کی متداول کتب میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق مذکور ہیں۔ بخاری کے مشہور شارح جن کا عباسی صاحب اپنی تالیف میں بار بار ذکر کرتے ہیں انہوں نے اصابہ میں ابوہریرہؓ کے حوالے سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے:

عن ابی ھریرۃ قال ابصرت عینای

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میری ان آنکھوں

هاتان وسمعت اذناي رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو آخذ بکفي حسین، وقدماه علی قدم رسول الله وهو یقول ترق ترق عین بقه، قال فرقي الغلام حتی وضع قدمیه علی صدر رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم قال له رسول الله صلی الله علیه وسلم افتح فاك ثم تفل ثم قبله ثم قال اللهم احبه فانی احبه۔

(اصابہ ابن حجر عسقلانی۔ ج ۱ ص ۱۴۴۔ ۱۴۵)

نے دیکھا اور کانوں نے سنا کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھوں کو پکڑے ہوئے تھے اور حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کے پاؤں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں پر رکھے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اے ننھے قدموں والے چڑھ آ۔ چڑھ آ۔ چنانچہ بچہ جسمِ اطہر پر چڑھنے لگا یہاں تک کہ اپنے قدم حضورؐ کے سینے پر رکھ دیئے۔ پس آپ نے فرمایا "منہ کھول" پھر آپؐ نے لعابِ دہن ڈالا اور مُنہ چوم لیا۔ پھر فرمایا۔ اے اللہ! اسے محبوب رکھ کہ میں اسے محبوب رکھتا ہوں۔

اسی طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے:

"یہ دونوں میرے بیٹے اور میری بیٹی کے لڑکے ہیں، اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان دونوں سے اور اُن کے ساتھ محبت رکھنے والوں سے محبت فرما۔" (ترمذی)

یزید کے معاملے میں ایک قسم کی "نامناسب جانبداری" اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مرتبہ کے متعلق ایک عام لاپروائی کتاب کے ہر صفحہ پر نمایاں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ وہ ہر قاری کو اس بات کا تاثر دینا چاہتے ہیں کہ عام مسلمانوں نے یزید کی بیعت بطیبِ خاطر کی اور اُن کی اس بیعت پر پوری امت مجتمع تھی۔ حالانکہ عباسی صاحب جن کتب کو اس بارے میں بطورِ اساس مانتے ہیں انہی کے مطالعہ سے جو صورتِ حال نظر آتی ہے وہ اُن کے استدلال کے بالکل برعکس معلوم ہوتی ہے۔ ہم یہاں صرف اس کی ایک مثال عرض کرتے ہیں:

مصنف البدایہ والنہایہ کی مندرجۂ ذیل عبارت یزید کی بیعت کی تائید میں درج کرتے ہیں۔

فاتسقت البیعۃ لیزید فی سائر البلاد — تمام شہروں میں یزید کی بیعت ہو گئی اور یزید کے

وفدت الوفود من سائر الاقاليم الی یزید | پاس ہر سمت سے وفود آئے۔

(ص۴۵ بحوالہ البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص۸۰)

مگر جس "طیب خاطر" سے یہ بیعت لوگوں نے کی تھی اُس کا ذکر عباسی صاحب جان بوجھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ حالانکہ وہ فقرات اُن کی اسی عبارت سے متصلاً پہلے موجود ہیں:

ثم خطب معاویۃ وھولاء حضور تحت منبرہ، بایع الناس لیزید وھم قعود ولم یوافقوا ولم یظھروا اختلافاً لما یتھددھم وتوعدھم فاتسقت البیعۃ والبدایہ والنہایہ جلد ۸ ص۸۰	پھر حضرت امیر معاویہؓ نے خطبہ دیا اور یہ لوگ اُن کے منبر کے نیچے موجود تھے۔ لوگوں نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کی اور یہ لوگ بیٹھے تھے نہ موافقت کی اور نہ اختلاف ظاہر کیا، کیونکہ انہیں ڈرایا اور دھمکایا جا چکا تھا۔ اس طرح یزید کی بیعت تمام ممالک میں ہو گئی

پھر جو حکم یزید نے عامل مدینہ ولید کو دیا تھا اُس سے اُس کے تیوروں کا باسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس طرح "بغیر جبر واکراہ" کے امام حسین رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ سے بیعت لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اما بعد فخذ حسینا وعبد اللہ بن عمر وابن الزبیر بالبیعۃ اخذاً لیس فیہ رخصۃ والسلام۔ (ابن اثیر ج ۴ ص۶)	تم حسین، عبداللہ بن عمر اور ابن زبیر سے بیعت لو اور ایسی گرفت کرو جس میں کوئی رعایت نہ ہو۔

یہ ہے اُس بیعت کی اصل حقیقت جسے عباسی صاحب "طیب خاطر" سمجھتے ہیں۔

عباسی صاحب نے نہ صرف یزید کے معاملے میں ذہنی جانبداری کا ثبوت دیا ہے بلکہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات سے بھی انصاف نہیں برتا۔

اسی سلسلہ میں آپ مندرجہ ذیل فقرے ملاحظہ فرمائیں:

"افسوس کہ حضرت موصوف نے اپنے بھائی کا عاقلانہ مشورہ قبول نہ فرمایا اور بیعت

لے لی، یہ بیعت چونکہ باغیوں اور قاتلوں کی تائید بلکہ اصرار سے ہوئی تھی اور یہ خلافت ہی حضرت عثمان ذی النورینؓ جیسے محبوب خلیفۂ راشد کو ظلماً اور ناحق قتل کرکے سبائی گروہ کے اثر سے قائم کی گئی تھی، نیز قاتلین سے قصاص جو شرعاً واجب تھا نہیں لیا گیا تھا اور نہ قصاص کے لیے جانیکا کوئی امکان باقی رہا تھا کیونکہ یہی باغی اور قاتل اور اس گروہ کا بانی مبانی عبداللہ بن سبا مبایعین کے گروہ میں نہ صرف شامل بلکہ سیاست وقت پر اثر انداز رہے۔ اکابر صحابہ نے بیعت کرنے سے گریز کیا، اس لیے بیعت خلافت مکمل نہ ہوسکی۔" صـ۲

"سبائیوں کی حرکاتِ شنیعہ سے امت میں جو انتشار پیدا ہوگیا ... ... تمام عالمِ اسلام میں خلیفہ شہید کے مظلومانہ قتل سے اک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف سے انتقام انتقام کا نعرہ بلند ہوا۔ یہ صورتِ حال بہت حد تک سنبھل سکتی تھی اگر قصاص لینے کی تدبیر کی جاتی مگر قصاص نہ لیا گیا۔" صـ۳

"حضرت موصوف (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کی یہ خطائے اجتہادی یا بے بسی اور مجبوری، نتیجہ یہ ہوا کہ بخلاف حضرت خلفائے ثلاثہ جن کی بیعت پر تمام امت مجتمع تھی، اتحاد و اتفاق تھا، کفار کے مقابلے میں جہادی سرگرمیاں تھیں۔ بڑے بڑے ملک فتح ہوئے مگر حضرت علیؓ کے زمانے میں نہ کوئی جہاد ہوا، نہ کوئی ملک و شہر فتح ہوا، نہ ملت ان کی بیعت پر مجتمع ہوئی۔ آپس میں تلواریں چلتی رہیں۔" (صـ۳-۴)

آپ ان سارے اقتباسات کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان میں کونسا تاثر پیدا کرنے کی کوشش مضمر ہے۔ اس سے ایک اثر قاری کے ذہن میں یہ پڑتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معاذاللہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینا نہ چاہتے تھے یا کم از کم اس کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانے پر تیار نہ تھے۔ حالانکہ اصل صورت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر اس کے لیے کسی موزوں موقع کی تلاش میں تھے

اس کے علاوہ ایک دوسرا تاثر ان صفحات کے مطالعہ سے ذہن پر یہ بھی مترتب ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جتنے بھی لوگ تھے وہ گویا سب کے سب سبائی تھے اور حضرتؓ اُن کے ہاتھ میں محض ایک بے بس کھلونا تھے جن سے وہ جس طرح چاہتے کھیلتے رہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس موقف پر کھڑا کر کے اُن کے بارے میں جو رائے بھی قائم کی جائے گی وہ اُس مرتبہ سے بہر حال فروتر ہو گی جس کے فی الواقع وہ امت میں مستحق ہیں۔

ہمیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عباسی صاحب نے اُنؓ کے معاملے میں عناد کا ثبوت دیا ہے اور اُنؓ کے متعلق ایک ایسی غیر منصفانہ روش اختیار کی ہے جو کسی صاحب علم کو زیب نہیں دیتی۔ انہوں نے اپنے دلپسند افکار و نظریات کو برحق ثابت کرنے کے لیے بعض مقامات پر ایسی عجیب و غریب تاویلات بلکہ تحریفات کی ہیں کہ اس سے احساسِ دیانت کو سخت دھچکا لگتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور امام ابن تیمیہؒ کے فرمودات کے ساتھ انہوں نے جو ظلم اور زیادتی کی ہے وہ تو بہت ہی افسوسناک ہے

حضرت شاہ ولی اللہ اپنی تصنیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء کے بالکل آخری صفحات میں جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اس طرح ملت کی دوسری بزرگ و برتر ہستیوں کے باہمی اختلافات پر پہنچتے ہیں تو وہ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ ایک اختلاف تو وہ تھا جو خوارج نے کیا اور ایک اختلاف وہ تھا جس میں ام المومنین رضی اللہ عنہا اور بعض دوسرے جلیل القدر صحابہؓ بھی شامل تھے۔ پھر شاہ صاحب بتاتے ہیں کہ اختلاف کی ان دو مختلف نوعیتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ خوارج کا اختلاف فسادِ امت ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

اما آنکہ اہلِ حرورا بر باطل بودند بوجہ	اہلِ حروراء خوارج کا امر باطل پر ہونا اور اُن
سمتِ کفر یا فسوق و اعاذنا اللہ من ذالک	کا کفر یا فسق کے نشان سے متصف ہونا، خدا

پس ازاں جہت کہ احادیث متواترہ در باب حروریہ وارد شدہ است کہ یمرقون من الدین مروق السہم من الرمیۃ
(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص۲۷۸)

ہم کو اس سے پناہ میں رکھے، اس وجہ سے ہے کہ اُن کے بارے میں احادیثِ متواترہ وارد ہیں کہ وہ دین سے ایسے ہی نکل جائیں گے جیسا کہ تیر کمان سے۔

لیکن حضرت عائشہ، طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو اختلاف کیا ہے وہ محض ایک اجتہادی غلطی تھی اسے خروج نہیں کہا جا سکتا، اور شاہ صاحب خود بھی سمجھتے ہیں کہ حق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ ہی تھا۔ وہ اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اما آں کہ حضرت عائشہ و طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم مجتہد مخطی معذور بودند ازاں قبیل کہ من اجتہد فقد اخطأ فلہ اجر واحد پس ازاں جہت کہ متمسک بودند بشبہ ہرچند دلیل دیگر ارجح از وی بود و موجب آں شبہ دو چیز است، یکی آنکہ خلافت برائے حضرت مرتضیٰ منعقد نشد زیرا کہ اہل حل و عقد عن اجتہاد و نصیحۃ للمسلمین بیعت نہ کردہ اند۔
(ازالۃ الخفاء ص۲۷۹)

حضرت عائشہ و طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم سے جو اجتہادی غلطی ہوئی ہے وہ اس قبیل میں سے ہے "جس نے اجتہاد کیا اور اُس میں خطا کی، اُس کے لیے ایک اجر ہے"۔ اُن کی یہ غلطی اس اشتباہ کی بنا پر تھی (اگرچہ زیادہ مضبوط مسلک دوسرا ہی تھا) ایک یہ کہ حضرت مرتضیٰ کی خلافت منعقد نہ ہوئی تھی اور دوسرے یہ کہ اربابِ حل و عقد نے غور و فکر اور مسلمانوں کی خیر خواہی دیکھ کر بیعت نہ کی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ پھر اسی بنیاد پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے کو بھی اجتہادی غلطی سے تعبیر کرتے ہیں:

و اما آنکہ معاویہ مجتہد مخطی معذور بود پس ازآں جہت کہ متمسک بود بشبہ ہرچند دلیل دیگر در میزان شرع راجح تر ازاں برآمد

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا مجتہد مخطی معذور ہونا اس وجہ سے ہے کہ انہیں اس معاملے میں شبہ لاحق ہو گیا تھا اگرچہ میزان شرع میں اس سے وزن دار حجت

مانند آنچہ در قصہ اہلِ جمل تقریر کردیم۔ (صفحہ ۲۸۰)

موجود تھی۔ یہ شبہ وہی تھا جس کا ہم نے اصحابِ جمل کے تحت ذکر کیا ہے۔

مصنّف کی ہنر مندی اور چابکدستی دیکھیے کہ انہوں نے صرف اس فقرہ کو دیکھ کر کہ "خلافت برائے حضرت مرتضیٰ قائم نہ شد" حکم فرما دیا کہ شاہ ولی اللہ بھی حضرت علیؓ کی خلافت کے معاملے میں یہی رائے رکھتے تھے جو خود اُن (مصنف صاحب) کی ہے۔ اس قسم کی تحریف علمی دیانتداری کے منافی ہے۔ شاہ صاحب جو بات کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا اور بعض دوسرے صحابہؓ نے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیعت نہیں کی تو اس کی اصل وجہ کچھ نفاق اور فسادِ نیت نہ تھا بلکہ یہ محض اُن کی اجتہادی غلطی تھی۔ کیونکہ انہیں اس امر کا شبہ تھا کہ حضرت علیؓ کی خلافت منعقد نہیں ہوئی۔ پھر شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اس بات کا اعادہ کیے جا رہے ہیں کہ "ہر چند دلیلِ دیگر ارجح ازوے بود" یعنی اُس شبہ کے مقابلے میں قوی دلیل بہر حال دوسری ہی ہے۔"

معلوم نہیں عباسی صاحب نے کن مصلحتوں کی بنا پر اس فقرہ کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور صرف ایک فقرہ کو اُس کے سیاق و سباق سے بالکل الگ کر کے ایک ایسا نتیجہ اخذ کیا ہے جو سرتاپا غلط اور شاہ صاحب کے مدعا اور منشا کے عین خلاف ہے۔

اسی قسم کا ظلم انہوں نے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ پر بھی کیا ہے۔ شیخ کا مسلک حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے بارے میں وہ نہیں جو عباسی صاحب نے اپنی اس کتاب میں اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف منہاج السنہ میں نہایت واضح طور پر یہ بتایا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑا تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

بل هم كلهم متفقون على انه اجل قدرا واحق بالامامة وافضل عند الله وعند رسوله وعند المومنين من

بلکہ اہلِ سنت پورے کے پورے اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت علیؓ معاویہ، معاویہ کے باپ اور معاویہ کے بھائی جو معاویہ کی بہ نسبت بہتر تھے، ان سب کے

معاویۃ وابیہ واخیہ الذی کان خیراً منہ۔	مقابلے میں زیادہ جلیل القدر اور امامت کے مستحق تھے اور اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کے نزدیک افضل ہیں۔
وعلی افضل ممن ھو افضل من معاویۃ رضی اللہ عنہ فالسابقون الاولون الذین بایعوا تحت الشجرۃ کلھم افضل من الذین اسلموا عام الفتح وفی ھؤلاء خلق کثیرا فضل من معاویۃ واھل الشجرۃ افضل من ھؤلاء کلھم وعلی افضل جمھور الذین بایعوا تحت الشجرۃ بل ھو افضل منھم کلھم الا الثلاثۃ۔ (جلد دوم ص ۲۵۶)	حضرت علیؓ ان لوگوں سے بھی افضل ہیں جو امیر معاویہؓ کی بہ نسبت افضل تھے وہ السابقون الاولون جو بیعت شجر میں شریک تھے وہ سارے اُن لوگوں سے مرتبے کے لحاظ سے افضل ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے اور جن میں ایک کثیر خلقت ہے جو معاویہ سے افضل ہے۔ بیعت شجر کی سعادت پانے والے ان سے بھی بہتر ہیں اور حضرت علیؓ تو ان لوگوں سے بھی افضل ہیں جو بیعتِ شجر میں شریک تھے، بلکہ وہ

سوائے تین کے (ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ) باقی تمام امت میں سب سے افضل ہیں۔

البتہ امام ابن تیمیہؒ جو بات کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ شیعہ حضرات جن دلائل کی بنا پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر معترض ہوتے ہیں انہیں اعتراضات کو اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ پر لوٹا دیا جائے تو ان سے پھر ان کی ذات بھی مجروح ہوگی۔

عباسی صاحب نے کتاب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کے لیے خروج (ص ۲۳) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بہت بڑی جسارت ہے اور یہ چیز جمہور اہلِ سنت کے مسلک کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اختلافات کے اس پورے دور میں جو واقعات رونما ہوئے اُن کی نوعیتیں اتنی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہیں کہ انہیں محض تاریخ کی مدد سے سلجھایا نہیں جاسکتا۔ واقعات کا جب سلسلہ قائم ہوتا ہے تو اُس وقت اس کے ساتھ ایک ایسا جذباتی ماحول بھی بن جاتا ہے جس سے ہم کسی معاملے کے متعلق بھی دو اور دو چار کی طرح فیصلہ نہیں کر سکتے لہٰذا ہم اس روش کو ہی صحیح نہیں سمجھتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی تعلقات کے بارے میں ہم محض تاریخ کی مدد سے کوئی حکم لگائیں۔ وہ حضرات جنہیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے

کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے وہ محض تاریخی شخصیتیں نہیں جن پر بڑی بے تکلفی سے جرح و تعدیل کرتے رہیں۔ قرآن مجید نے ان خوش نصیب ہستیوں کی تعریف کی ہے۔ اس لیے ہمیں اُن نفوسِ قدسیہ کے بارے میں غیر معمولی حد تک محتاط رہنا چاہیے اور کوئی لفظ اپنی زبان سے ایسا نہ نکالنا چاہیے جس سے سوءِ ادب کا پہلو نکلتا ہو۔

یزید کے متعلق بھی ہم وہی رائے صحیح سمجھتے ہیں جو جمہور اہلِ سنت کی ہے کہ اُسے نہ تو کافر و زندیق کہا جائے اور نہ ہی ائمہ ہدیٰ میں شمار کیا جائے۔ ممکن ہے وہ قتلِ حسین کا خواہشمند نہ ہو، مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اُس نے اس حادثہ پر بیزاری ظاہر کی یا اُن لوگوں کو کوئی سزا دی یا اُن سے اس ظالمانہ حرکت پر سختی سے مواخذہ کیا جنہوں نے اس جرمِ شنیع کا ارتکاب کیا، یا اُن کے خون کا قصاص لینے کی فکر کی۔ اس بنا پر نہ تو اُسے کافر و زندیق کہنا درست ہے اور نہ ہی رحمۃ اللہ علیہ کہنا صحیح اور مناسب ہے، وہ بادشاہوں کی طرح محض ایک بادشاہ تھا۔ اُس کے بارے میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ جاہلوں اور فتنہ پردازوں کی باتوں سے محض چڑ اور ضد میں آ کر اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا ہمارے نزدیک بالکل غلط روش ہے جس کی کوئی معقول انسان تائید نہیں کر سکتا۔

مطبوعات

سرگزشت غزالیؒ تالیف مولانا محمد حنیف صاحب ندوی۔ شائع کردہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۱۸۸۔ قیمت تین روپے۔

زیرِ تبصرہ کتاب سرگزشتِ غزالی امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مشہور تصنیف اَلمُنقِذ من الضلال، کا نہایت شستہ ترجمہ ہے۔ اس میں امام صاحبؒ نے اپنی اُن ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کو بیان کیا ہے جو ایک طالبِ حق کو بالعموم ابتدائی منازل میں پیش آتی ہیں۔ چنانچہ جس وقت سب سے پہلے اُن کے ذہن کے اندر ایک طوفان پیدا ہوا تو انہوں نے شان و شوکت کی زندگی کو خیر باد کہا۔ پھر تقلیدی عقائد کے متعلق کچھ شکوک و شبہات کے کانٹے چبھنے لگے اور خیال ہوا کہ ایمان کامل شعور کے ساتھ ہونا چاہیے اور وہ بھی اس حد تک پختہ کہ اس کے اندر شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس کے لیے انہوں نے فلسفہ اور منطق کی بھی خاک چھانی مگر یہاں سے بھی انہیں ناکام لوٹنا پڑا اور بالآخر انہوں نے تصوف کی آغوش میں پناہ لی اور یہیں سے انہیں ذہنی سکون اور طمانیتِ قلب کی دولت فراہم ہوئی۔ یہ کتاب دراصل فلسفہ سے تصوف کی طرف سفر کی رُوداد ہے اور اسی ضمن میں دوسرے کئی بحث طلب مسائل بھی سامنے آگئے ہیں۔

امام غزالیؒ کی اس فاضلانہ تصنیف پر مولانا محمد حنیف صاحب ندوی نے جو مبسوط مقدمہ لکھا ہے اس نے اس کتاب کی افادیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں مولانا نے اس کتاب کی تقریب و تعارف کا حق ادا کر دیا ہے۔ اندازِ بیان بڑا موثر اور فکر انگیز ہے اور اس کے مطالعہ سے اُن کے تبحرِ علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کے موضوعات اگرچہ نہایت ثقیل ہیں لیکن جس دل نشین پیرایے میں انہیں بیان کیا گیا ہے اُس سے کہیں بھی اکتاہٹ پیدا کرنے والی ثقاہت اور سنگینی پیدا نہیں ہونے پاتی۔

فاضل مترجم نے جگہ جگہ امام غزالیؒ کے افکار و خیالات کا جو مغربی مصنفین کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اس سے کتاب کی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے خصوصاً قانونِ تعلیل کی حیثیت کو متعین کرتے وقت انہوں نے جو بحث کی ہے وہ بڑی جاندار ہے۔ عام لوگ یہی خیال کرتے ہیں کہ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں ہر چیز علت و معلول کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے مثلاً آگ کا کام جلانا ہے، برف کا کام سرد کر دینا، گیہوں بو کہ آدمی گیہوں ہی کاٹے گا جو کی فصل اُسے میسر نہیں آسکے گی۔ امام غزالیؒ علت و معلول کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔ ان کا خیال ہے کہ علت و معلول کا سلسلہ محض ذہنِ انسانی کے تصور اور عادت کی کرشمہ سازی ہے یعنی آگ اور جلانا دو واقعات یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ لازماً ایک دوسرے کا نتیجہ ہوں۔ یہاں پہنچ کر فاضل مترجم نے ہیوم کا مقابلہ امام غزالیؒ سے کیا ہے۔

اس کے بعد لاک اور برکلے کے حوالے سے ہیوم کی تشکیک کا جائزہ لیا ہے اور پھر غزالیؒ کی تشکیک تک بات پہنچائی ہے اور اس امر کا فیصلہ کیا ہے کہ غزالیؒ کی تشکیک کا سبب ان کی اشعریت ہے جہاں کہ اخلاقیات میں علت و معلول کا سلسلہ معتبر نہیں بلکہ شارع علیہ السلام کا حکم ہی سب کچھ ہے۔ یہیں سے اُن کا ذہن سلسلۂ تعلیل کے ابطال کی طرف منتقل ہوا اور انہوں نے سوچا کہ جو بات اخلاق کے دائرے میں درست ہے وہ طبیعیات کے دائرے میں درست کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ معجزے کا مسئلہ بھی ایک مسئلہ تھا، جس کی توجیہ بھی بغیر سلسلۂ تعلیل کے انکار کے بن نہیں آتی تھی۔ اس بحث کے بعد مترجم نے اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار نہایت محتاط اور رچے تلے الفاظ میں کیا ہے اور میانہ روی کو اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے جو نہایت مناسب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "بات یہ ہے کہ عقل و دانش کی درماندگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس قسم کے مسئلہ میں دو ٹوک رائے قائم نہیں کی جاسکتی چنانچہ نہ تو یہ موقف تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہاں ہر ہر ظہور ایک علت چاہتا ہے اور نہ ہی یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مطلقاً

سلسلۂ تعلیل کا وجود ہی نہیں۔ حق ان دونوں کے بین بین ہے۔

امام غزالی کو اس مسئلہ تعلیل کی وجہ سے ہی معجزات کی اہمیت کو کم کرکے دکھانا پڑا اور وہ کہنے پر مجبور ہوتے تھے کہ علم آپ اپنا معیار ہے اور حق اپنے اثبات کے لیے کسی بیرونی سہارے کا رہین منت نہیں اس لیے خوارق و معجزات سے جو اذعان و یقین حاصل ہوتا ہے اس کا مرتبہ زیادہ بلند نہیں بلکہ علم کی اس نوعیت سے بہر حال فروتر ہے جو دلیل و برہان سے حاصل ہوتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ دلیل و برہان کا یہ شیدائی فلسفہ و حکمت سے بھی تسکین قلب حاصل نہ کر سکا۔ علم کلام کا ماہر ہوتے ہوئے وہ سکونِ قلب حاصل کرنے میں یکسر ناکام رہا اور اسے اس دولت کے حصول کیلیے علم لدنی اور انکشافاتِ وجدانی کا ہی دست نگر ہونا پڑا

الغرض پوری کتاب بڑی معلومات افزا اور مفید ہے۔ کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت بھی عمدہ ہے۔

سائنس اور تصوف از جناب احمد محمودی سحر صاحب۔ صفحات ۱۲۸ قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ: جناب احمد محمودی سحر صاحب۔ مکان نمبر ڈی ۵/۳ پلاٹ نمبر ۵ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵

زیر تبصرہ کتاب "سائنس و تصوف" میں بعض اعتقادی مسائل مثلاً وجودِ خدا، ضرورتِ وحی، ایمان بالرسالت وغیرہ کو سائنسی معلومات کے حوالے سے ایک مکالمہ کی صورت میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موصوف اپنی اس سعی میں کافی حد تک کامیاب ہیں، خصوصاً شروع کے پچاس صفحات بڑے جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ زبان سلیس اور طرزِ استدلال سلجھا ہوا۔ اصطلاحات کا ترجمہ آسان اور قابلِ فہم ہے۔ آخر میں سائنس کی اصطلاحات کے ساتھ رباعیات کچھ زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتیں۔ مغربی علماء اب اس طرف مائل ہو رہے ہیں کہ خدا اور مذہب وغیرہ کے مسائل پر سائنس کی ایجادات کے حوالہ سے روشنی ڈالیں تاکہ وہ آج کل کے لوگوں کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہو سکیں اس لیے ہمارے ہاں بھی یہ کوشش ایک حد تک پسندیدہ ہے جس سے ممکن ہے سائنس گزیدہ لوگوں کا کچھ علاج ہو سکے لیکن ہم اس طرزِ استدلال کو ابتدائی منزل کے بعد کچھ کارآمد نہیں پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس

کی دنیا اور مذہب کی دنیا ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہیں کہ سائنس کو کبھی بھی مذہبی مسائل کے سمجھنے کے لیے ہر گام پر مشعلِ راہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اس قسم کے دلائل سے کچھ دیر کے لیے تو آدمی مطمئن ہو جاتا ہے لیکن جب ذہن کچھ ترقی کرتا ہے یا سائنس کے اندر کچھ تغیرات ہوتے ہیں تو اس سے مذہب کی پوری عمارت ہل جاتی ہے۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھ کر کام کیا جاتے تو شاید کچھ مفید نتائج سامنے آسکیں۔

قدیم مشرق جلد اول و دوم از پروفیسر سید علین الحق صاحب ایم اے، شعبۂ تاریخ اردو کالج کراچی۔ ناشر: مکتبہ فریدی اردو کالج، اردو روڈ کراچی نمبر ا۔ قیمت جلد اول پانچ روپیے جلد دوم چھ روپے چار آنے۔ مکمل سیٹ کی قیمت دس روپے دس آنے۔

ہمارے ہاں تاریخ دانی کا سارا ذوق بادشاہوں، اُن کے محلات اور اُن کے درباروں سے متعلق رہا ہے۔ اب جبکہ لوگوں کے فکر و نظر کے زاویے کچھ متغیر ہوتے ہیں تو اُن کے اندر یہ احساس آہستہ آہستہ پرورش پانے لگا ہے کہ دنیا کے اس ہنگامۂ خیر و شر میں صرف بادشاہ ہی شریک نہیں رہے بلکہ عوام کا بھی اس میں نہایت اہم حصہ ہے۔ چنانچہ اب تاریخ کا محور بادشاہوں کی بجائے عوام بنتے چلے جا رہے ہیں اس لیے فلسفۂ تاریخ کے ماہرین اس دور میں اُن رجحانات کا پتہ لگانے میں مصروف ہیں جن سے انسان کے تہذیبی ارتقا کی ساری کڑیوں کو جوڑا جا سکے۔ اب تاریخ بادشاہوں کی جنگوں کا مستند ریکارڈ نہیں بلکہ انسانی تہذیب و تمدن کی دلچسپ داستان ہے۔ فکر و نظر کی اس تبدیلی کے تحت یورپ میں تو یہ کام کافی ہو چکا ہے مگر ہمارے ملک میں ابھی تک اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا گیا۔ پروفیسر علین الحق صاحب اس ملک کے سارے اہلِ علم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حالات کی نامساعدت کے باوجود اس طرف ایک عملی قدم اٹھایا۔ اُن کی یہ کوشش ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ پہلے حصے میں وادیٔ نیل کی داستان درج ہے اور دوسرے حصّہ میں ہند و پاک اور چین کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ زبان سلیس اور شستہ ہے۔ فاضل مصنف نے انگریزی

عربی، اردو اور فارسی کی جن ادق اور لاتعداد کتب کی ورق گردانی کی ہے اس سے اُن کے ذوق اور تجرِ علمی کا پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ انٹر آرٹس کے طلبہ کے لیے تاریخ عام اور اسلام کے نصاب کے مطابق مرتب کی گئی ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ طلبہ کے علاوہ ہر پڑھے لکھے انسان کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔

اسلام کا نظامِ قانون | مرتب و مترجم: ملک غلام علی صاحب شائع کردہ مکتبہ چراغِ راہ کراچی۔ قیمت تین روپے بارہ آنے۔ صفحات ۲۹۱

زیرِ تبصرہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مشہور دینی تحریک الاخوان المسلمون کے نائب مرشدِ عام الشہید عبد القادر عودہ کی شہرہ آفاق تصنیف "الاسلام واوضاعنا القانونیۃ" کا ترجمہ ہے۔ دوسرے حصے میں بعض ایسے قابلِ قدر مضامین کے تراجم ہیں جو عودہ شہید کے افکار و تصورات سے ہم آہنگ ہیں۔ ان مقالات کے لکھنے والوں میں الاخوان المسلمون کے بانی الاستاذ الامام حسن البناؒ شہید، دمشق کے کلیۃ الشریعہ کے پروفیسر شیخ مصطفٰے احمد الزرقاء اور سر الفرڈ ڈیننگ جیسے فضلا شامل ہیں۔ عبد القادرؒ شہید نے قانون کی حقیقت و ماہیت اور تنظیم معاشرہ میں اُس کی اہمیت کو سب سے پہلے واضح کیا ہے اور پھر نہایت سلجھے ہوئے انداز میں یہ بتایا ہے کہ انسانی قانون اور الہامی قانون میں کیا فرق ہے اس کے ساتھ ہی انہوں نے بڑے زوردار دلائل کے ساتھ قوانین شرعیہ کی فوقیت اور برتری بھی ثابت کی ہے۔ سب کے آخر میں انہوں نے ایک داعی کے جذبے اور دلسوزی کے ساتھ مسلمانوں سے اس بات کی اپیل کی ہے کہ وہ پھر سے اسلامی قوانین کو اپنے ہاں نافذ کر کے اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور طاقت کو دوبارہ حاصل کریں۔

کتاب کے مترجم ایک فاضل شخصیت ہیں اور انہوں نے ان مباحث کا ترجمہ نہایت اچھے انداز سے کیا ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی کو اوّل تا آخر قائم رکھا گیا ہے۔

کتاب کا معیار طباعت و کتابت البتہ موضوع کے شایانِ شان نہیں۔

رسائل و مسائل

رویتِ ہلال کا مسئلہ

سوال۔ پاکستان میں رویتِ ہلال کے بارے میں کم و بیش تیرہ سال سے اختلاف ہی چلا آرہا ہے۔ اکثر سنجیدہ آدمیوں کو کہتے سنا ہے کہ مسلمان عید جیسی تقریب پر بھی اتفاق کا ثبوت نہیں دیتے اور مختلف مقامات پر ایک دن عید نہیں ہوتی۔ کیا اس صورتِ حال کو کسی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا ؟

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی غور طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ ایا ایک جگہ چاند کا نظر آجانا دوسرے مقامات کے لیے قابلِ اعتبار ہو سکتا ہے ؟ مثال کے طور پر اگر چاند کی رویت کراچی میں صحیح بھی مان لی جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ چاند لاہور میں بھی اُسی دن نظر آجائے حالانکہ دونوں کے عرض البلد میں فرق ہے براہِ کرم اس مسئلے پر اظہارِ خیال فرمائیں کہ اس انتشار و اختلاف کو رفع کرنے کی کیا شکل ہو سکتی ہے ؟

جواب۔ عید کے موقع پر رویتِ ہلال کے سلسلہ میں جو گڑبڑ ہوئی ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی پاکستان میں کئی بار یہ صورت رونما ہو چکی ہے اور اس سے عام مسلمانوں میں بڑی پریشانی پیدا ہوتی رہی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان قائم ہونے سے پہلے متحدہ ہند میں کبھی اس طرح انتشار برپا نہیں ہوا تھا۔ اب اگر حکومت اور علماء باہمی تعاون سے کام کریں تو اس انتشار کو بآسانی رفع کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ پاکستان کے ہر ضلع میں دو عالم ایسے مقرر کیے جائیں جن کا

اپنے علاقہ میں بھی اعتماد ہو اور ان کے ضلع سے باہر بھی لوگ اُن کو جانتے ہوں اور ان پر اعتماد رکھتے ہوں۔ اسی طرح ڈھاکہ، کراچی اور لاہور میں پانچ پانچ علماء کی ایک مجلس مقرر کر دی جائے جو عام طور پر ملک میں قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔ حکومت کی طرف سے اضلاع کے علماء کو یہ سہولت بہم پہنچائی جائے کہ اپنے شہر سے مذکورہ بالا تینوں مراکز میں سے کسی ایک مرکز پر وہ بذریعہ ٹیلیفون ہلال کے دیکھے جانے یا نہ دیکھے جانے کی اطلاع رات کے نو بجے تک پہنچا دیں۔ ان تینوں مراکز کے علماء ان اطلاعات کی بنا پر اور خود اپنے شہر اور آس پاس کے علاقوں کی اطلاع کی بنا پر یہ فیصلہ کریں کہ چاند ہوا ہے یا نہیں ہوا ہے۔ نیز یہ تینوں مراکز باہم ٹیلیفون پر اپنی اطلاعات کا تبادلہ بھی کریں۔ اور پھر ان تینوں مرکزوں میں سے کسی ایک مرکز سے آخری فیصلہ ریڈیو پر کوئی عالم نشر کرے اور وہ ایسا عالم ہونا چاہیے جس کی آواز بالعموم ملک میں پہچانی جاتی ہو، مثلاً مفتی محمد شفیع صاحب جن کی آواز ملک میں لاکھوں آدمی پہچانتے ہیں یا اور کوئی دوسرا شخص جس کی آواز پہچاننے والے ملک میں ہزاروں لاکھوں آدمی موجود ہوں۔ ریڈیو پر اطلاع ایک وقتِ معیّن میں نشر ہونی چاہیے۔ مثلاً رات کے دس بجے۔ اور پہلے سے یہ چیز ملک میں معلوم ہونی چاہیے کہ فلاں وقتِ مقررہ پر ریڈیو سے چاند کا اعلان ہوگا۔ اس طرح آسانی سے انتشار ختم کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلیفون پر بالعموم آواز پہچانی جاتی ہے۔ اگر کوئی معتبر عالم اطلاع دیں گے تو وہ بھروسے کے قابل ہوگی۔ اس طرح ریڈیو پر بھی آواز پہچانی جاتی ہے۔ ملک کے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے یہ صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے کہ دو تین علماء باری باری بیان نشر کریں۔ لوگ ان کی آواز پہچانیں گے اور ان کے قول پر اعتماد کریں گے۔

بہر حال اس ملک کے باشندے دینی معاملات میں جو اعتماد علماء پر رکھتے ہیں وہ کسی اور پر نہیں رکھتے۔ برسرِ اقتدار لوگوں کو "مُلّا" سے جو بھی نفرت ہے، ہوا کرے۔ مگر دینی معاملات میں عام مسلمان بہر حال "مُلّا" ہی پر بھروسہ رکھتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے

کہ ریڈیو پر کوئی خاتون خبریں سناتے ہوئے چاند ہونے کی اطلاع دیں اور ان کے ارشاد پر ملک میں روزے رکھے اور توڑے جائیں۔ جن لوگوں کو اس ملک میں حکومت کرنی ہے انہیں اپنی قوم کے مزاج اور اس کی روایات کا لحاظ کرنا ہی پڑے گا ورنہ بجز اس کے کہ کشمکش پیدا ہو اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔

اختلافِ مطالع کی بنا پر ایک جگہ چاند نظر آنے اور دوسری جگہ نظر نہ آسکنے کا مسئلہ بھی ہمارے لیے زیادہ موجبِ تشویش نہیں ہونا چاہیے۔ فقہائے احناف کا عام مسلک اس معاملے میں یہ ہے کہ مطلع کا اختلاف شرعاً معتبر نہیں ہے اور ایک جگہ سے رؤیت کی شہادت یا خبر یقینی طور پر جس دوسری جگہ بھی پہنچ جائے، وہاں کے لوگ اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ تاہم اختلافِ مطالع کا لحاظ اگر رکھا بھی جائے، تب بھی ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں عملاً رؤیت پر اس کا کوئی بڑا اثر نہیں پڑ سکتا اور کوئی وجہ نہیں کہ مثلاً کراچی کی رؤیت کو لاہور کے لیے قابلِ اعتبار نہ سمجھا جائے۔ اسلام عامۃ الناس کے لیے ایک سیدھا سادا دین ہے جس کے احکام کو منطبق کرنے کے لیے غیر ضروری تکلفات کی حاجت نہیں ہے۔ رؤیتِ ہلال کے معاملے میں بھی یہ ضروری نہیں کہ جن چھوٹے یا بڑے مقامات پر چاند دکھائی دے پہلے ان کے اور ان کے ہم مطلع مقامات کا تعین علمِ ہیئت و ریاضی کے باریک اصولوں کے مطابق کیا جائے اور پھر صرف انہی مقامات میں چاند ہونے کا اعلان کیا جائے۔

رؤیتِ ہلال کے مسئلے کو حل کرنے کی موزوں ترین صورت یہی ہے کہ پورے شرعی قواعد و ضوابط اور تحقیق و تفتیش کے بعد ملک کے کسی ایک مرکزی مقام سے چاند نظر آنے یا نہ آنے کا اعلانِ عام ایسے اصحاب کے ذریعے سے کیا جائے جن کے دین و تقویٰ پر عام مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جن کی آواز ملک بھر میں پہچانی جاتے۔ اور اس اعلان کو پورے ملک کے لیے معتبر تسلیم کیا جانا چاہیے۔

(بقیہ: اسلامی طلاق)

اگرچہ اونچے طبقے کے لوگ نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں مگر ایک عام مسلمان اسے خوب سمجھتا ہے خود عورت کی خواہش بھی یہ ہوتی ہے کہ اُس کی گود بچّے سے ہری ہو جائے تاکہ اس کا شوہر کسی وقت اُسے بے وفائی کی بھینٹ نہ چڑھا دے، کیونکہ عورت کو معلوم ہوتا ہے کہ صاحب اولاد ہو کر وہ اپنے لیے حفاظت و اطمینان کا نہایت مضبوط بند باندھ دے گی۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ اُن طلاقوں کا صحیح تناسب معلوم کرنے کے لیے، جن سے فی الواقع عورت کو نقصان پہنچتا ہے طلاقوں کی فہرست عام سے رجعی طلاقوں کو، خلوتِ صحیحہ سے قبل واقع ہونے والی طلاقوں کو، اُن طلاقوں کو جن کے بعد دوبارہ نکاح ہو گئے اور زوجین کے باہمی اتفاق سے وقوع پذیر ہونے والی طلاقوں کو خارج کر دینا چاہیے۔ ہم نے طلاقوں کے جو اعداد و شمار دیکھے ہیں اُن میں ایسی طلاقوں کا تناسب اکثر و بیشتر تین فیصد سے بھی گرا ہوُا پایا ہے۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ کیا یہ حقائق ایسے ہولناک ہیں جو ہمیں طلاق کا دروازہ بند کر دینے اور زوجین کو یہ ذہن نشین کرانے پر مجبور کر رہے ہوں کہ نکاح دراصل ایک ایسا جیل خانہ ہے جہاں سے کسی حیلہ اور تدبیر سے بھی باہر قدم نہیں رکھا جا سکتا خواہ وہ کتنے ہی مصائب و آلام اور امراض و آفات سے بھر چکا ہو۔

طلاقِ شرعی سے بیزاری کی اصل وجہ | مذکورۂ بالا تصریحات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ یہ رائے مبنی بر صحت نہیں ہے۔ کہ مصر میں طلاق کا بہت غلط اور ناروا استعمال ہو رہا ہے۔ اور اسے بہانہ بنا کر طلاق شرعی کے احکام کو بدلنا ایک ناروا اور غیر دانشمندانہ قدم ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ مصر کے علاوہ دوسرے اکثر عربی ممالک کا بھی قریب قریب یہی حال ہے۔ لیکن اس کے باوجود خواتین کی کچھ انجمنیں ہیں، جو برابر احکام شریعت کو محو کر دینے کے مطالبات کر رہی ہیں۔ اِن انجمنوں کی پشت پناہی کرنے والے حضرات بھی ان سے متاثر ہو کر "اصلاح"

کو ناگزیر چارۂ کار بتا رہے ہیں۔ در اصل ان عورتوں اور مردوں کے زمرہ کے پس پردہ ایک ایسا عنصر کام کر رہا ہے۔ جس کی آرزو یہ ہے کہ اس ملک سے خاندان کا اسلامی ڈھانچہ ختم کر کے غیر اسلامی ڈھانچہ نصب کیا جائے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اصل حقیقت کی چھان بین کئے بغیر آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان مطالبات کی تائید کر رہے ہیں۔ اور ادھر حکمران گروہ ہے۔ جس کا خیال یہ ہے کہ اگر کچھ تغیر و تبدل کرنا ہے۔ تو اسلامی احکام کے اندر ہونا چاہیے۔

علمائے دین کا متفقہ فیصلہ "اصلاح و تبدیلی" کے ان رجحانات کے اندر اہل علم و دانش حضرات کی خواہش یہ ہے کہ خاندانی زندگی میں سے اسلامی نظام کو فارغطی نہ دی جائے۔ اسلام سے بڑھ کر خاندانی نظام کو مستحکم و مضبوط کرنے والا کوئی نظریہ نہیں ہے۔ اسلام ازدواجی روابط کو پختہ کرنے کے لیے قانون سے زیادہ تقویٰ اور خداترسی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ چنانچہ تمام علماء اس بارے میں متفق ہیں کہ طلاق کا اختیار مرد ہی کے پاس ہونا چاہیئے۔ البتہ مطالبۂ تفریق کے لئے عورت کے حق کو مزید وسیع کر دیا جائے۔ چنانچہ علماء نے مرد سے عورت کی بیزاری کو بھی مطالبۂ تفریق کی جائز اساس قرار دے دیا ہے۔ نیز اس امر سے بھی اتفاق ہے کہ مرد کو حالتِ غصہ میں طلاق دینے سے سختی سے منع کیا جائے۔ بہر حال علماء میں اس بارے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ کہ تمام خرابیوں کا علاج ان حقوق شرعیہ کے دائرے کے اندر رہ کر کیا جائے۔ جو مرد کو اسلام نے دیئے ہیں۔

ایک ضروری اعلان

ہم نے اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، مکتبہ چراغ راہ، مکتبہ تعمیر انسانیت اور دوسرے اسلامی لٹریچر شائع کرنے والے اداروں کی کتب دفتر ترجمان القرآن سے بھی ضرورت مند حضرات کو مل سکیں۔ قارئین کرام اپنی ضرورت کے مطابق آرڈر بھیج سکتے ہیں۔

مینجر شعبۂ کتب ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور